وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْیَا ط

بیاد : سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

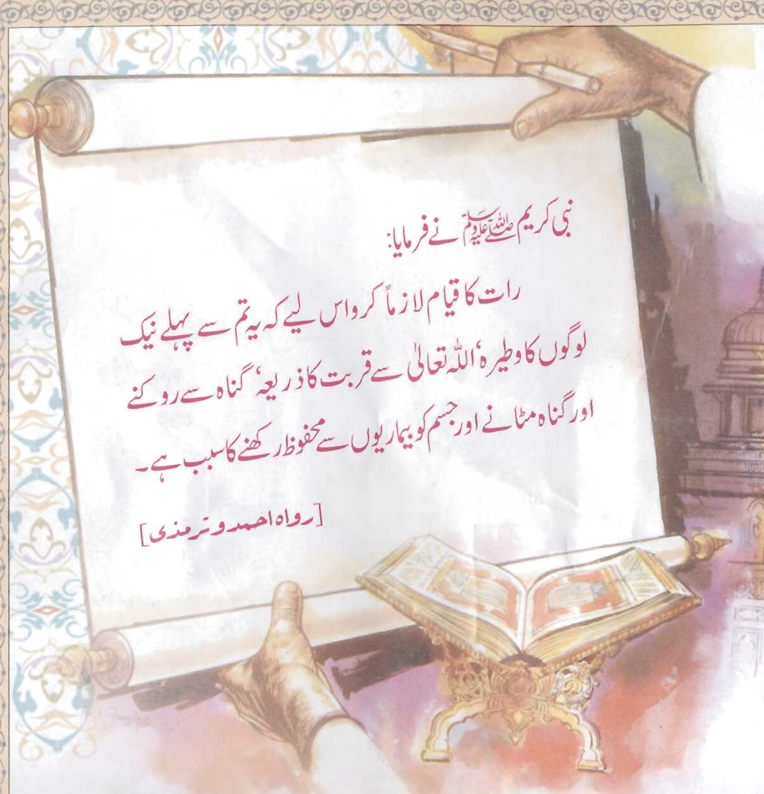
جنوری ۲۰۱۲ء

ماہنامہ عالمی

ترجمان القرآن

مدیر: پروفیسر خورشید احمد

الابلاغ ٹرسٹ


نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
رات کا قیام لازماً کرو اس لیے کہ یہ تم سے پہلے نیک
لوگوں کا وطیرہ، اللہ تعالیٰ سے قربت کا ذریعہ، گناہ سے روکنے
اور گناہ مٹانے اور جسم کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے کا سبب ہے۔
[رواہ احمد و ترمذی]

ماہنامہ عالمی

ترجمان القرآن

جلد۲، عدد ۱، صفر ۱۴۳۳ھ، جنوری ۲۰۱۲ء

مدیر: پروفیسر خورشید احمد
نائب مدیر: مسلم سجاد

⊛ ادارتی امور: منصورہ، ملتان روڈ، لاہور - ۵۴۷۹۰ فون: ۰۴۲-۳۵۴۲۵۳۵۶ فیکس: ۳۵۴۳۲۱۹۴ ای میل: tarjuman@wol.net.pk

⊛ انتظامی امور: ۶- صابر سٹریٹ، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور- ۵۴۶۰۰ فون: ۰۴۲-۳۷۵۰۲۰۴۸-۳۷۵۸۷۹۱۶ فیکس: ۳۷۵۳۵۶۲۰-۰۴۲

موبائل: ۰۳۰۷-۴۱۱۲۷۰۰ ای میل: tarjuman@tarjumanulquran.org ویب: www.tarjumanulquran.org

◉ قیمت فی شمارہ: ۳۵ روپے ◉ زرسالانہ: ۳۵۰ روپے ◉ ۵ سال کے لیے: ۱۵۰۰ روپے ◉ معاون خصوصی: ۶۰۰۰ روپے

◉ بنگلہ دیش، بھارت ۱۴۰۰ روپے ◉ ایران، مشرق وسطٰی، مشرق بعید، یورپ، افریقہ ۱۸۰۰ روپے ◉ امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا ۲۱۰۰ روپے

بنک اکاؤنٹ: بنام عالمی ترجمان القرآن، BOP, Ichhra, Br. Code 093, Lahore A/c 800-792-000-0

زیراہتمام: الابلاغ ٹرسٹ

کشمیر کی اصل اہمیّت

ہماری نگاہ میں کشمیر کے معاملے کی اصل اہمیّت اور غیر معمولی اہمیّت کس وجہ سے ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے ملک کے لیے ایک وسیع علاقہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، یا اپنے ملک کی معیشت کے لیے کشمیر کو ناگزیر پاتے ہیں۔ یہ ایک قوم پرست اور وطن پرست کا نقطۂ نظر تو ہوسکتا ہے، مگر ایک حق پرست کا نقطۂ نظر نہیں ہوسکتا۔ ہمارے لیے اس معاملے کی ساری اہمیّت صرف اس وجہ سے ہے کہ کشمیر کے ۳۰، ۳۵ لاکھ مسلمانوں کا مستقبل ہم کو خطرے میں نظر آرہا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ جموں کے علاقے سے بکثرت مسلمان نکالے جاچکے ہیں؟ کس کو معلوم نہیں ہے کہ پٹھانکوٹ سے دلّی تک کا علاقہ مسلمانوں سے خالی ہو چکا ہے؟ کس سے یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ ہندستان نے قصداً ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت اپنے اُن تمام علاقوں کو مسلمانوں سے خالی کرایا ہے جو مغربی پاکستان [موجودہ پاکستان] کی سرحد سے متصل واقع ہیں، اور اب اِسی پالیسی پر مشرقی پاکستان [موجودہ بنگلہ دیش] کی طرف بھی عمل ہو رہا ہے؟

اس کو دیکھتے ہوئے کبھی یہ توقع ہی نہیں کی جاسکتی کہ اگر کشمیر کی قسمت کا آخری فیصلہ ہندستان کے حق میں ہوگیا تو وہ زیادہ مدت تک اپنے انتہائی شمالی سرے پر ایک مسلم اکثریت کے علاقے کو برداشت کرتا رہے گا۔ کبھی نہ کبھی وہ وقت ضرور آئے گا جب کشمیر کی ساری مسلمان آبادی، مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کی طرح گھروں سے نکالی جائے گی اور مار مار کر اس کو بیک بینی و دوگوش پاکستان کی طرف دھکیل دیا جائے گا۔ آج کشمیریوں کی جو مدارات ہندستان میں ہورہی ہے یہ ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں ہے۔ یہ سب کچھ تو بس اسی وقت تک ہے جب تک کشمیر کا قضیہ معلّق ہے۔ اس کے یکسو ہو جانے کے بعد یہ ہرگز اُمید نہیں کی جاسکتی کہ ہندستان اس مسلم اکثریت کو پاکستان کے قریب یوں اطمینان سے بیٹھا رہنے دے گا۔ اس لیے اُن لاکھوں انسانوں کی خاطر جو کشمیر میں بستے ہیں، ان کی جان اور مال اور آبرو کی خاطر، اور ان کے پیدایشی انسانی حقوق کی خاطر ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ انھیں ہندستان کے چنگل سے نکالا جائے، اور ہم صاف کہتے ہیں کہ اس مقصد کے لیے ہم آخری حدود تک جانے کو تیار ہیں۔ (’مسئلۂ کشمیر‘، اجتماع کراچی کی افتتاحی تقریر، سیدابوالاعلیٰ مودودیؒ، ترجمان القرآن، جلد ۳۷، عدد ۴، ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ، جنوری ۱۹۵۲ء، ص ۲۸-۲۹)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

امریکی جارحیت، میموسکینڈل

اور___ پاکستان امریکی تعلقات کا بحران

پروفیسر خورشید احمد

۲۰۱۱ء اہل پاکستان کے لیے گوناگوں اور غیر معمولی صدمات کا سال ہونے کی حیثیت سے تاریخِ پاکستان کے حوالے سے ایک سیاہ باب کی حیثیت رکھتا ہے۔

حادثات کا یہ سلسلہ جنوری میں ریمنڈ ڈیوس کے خونیں واقعے سے شروع ہوا۔ پھر ۲مئی (ایبٹ آباد) کا واقعہ رونما ہوا، ۲۲مئی کو کراچی میں مہران نیول بیس پر حملہ ہوا، ۲۶نومبر کو سلالہ چیک پوسٹ پر امریکی افواج نے جارحانہ حملہ کیا اور گذشتہ تین ماہ سے ہم میموسکینڈل میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ غرض حقائق پر پردہ ڈالنے اور قومی احتساب سے فرار کے لیے طرح طرح کی بھونڈی حرکتیں کی جارہی ہیں۔ صاف نظر آرہا ہے کہ حکومتِ وقت اس طرح ایک عیارانہ منصوبہ بندی کے تحت عدلیہ اور فوج کے درمیان تصادم اور تقسیم اختیارات کے دستوری فارمولے کو پارہ پارہ کرتے ہوئے حکومتی اداروں کے درمیان کش مکش اور ٹکراؤ کا خطرناک کھیل کھیل رہی ہے۔ پیپلزپارٹی اور اس کے اتحادیوں کی حکومت نے پونے چار سال میں عوام کے اعتماد اور مینڈیٹ کو نہایت بری طرح پامال کیا ہے۔ اس وجہ سے موجودہ حکومت اخلاقی سطح پر اپنا حقِ حکمرانی کھوچکی ہے جو فروری ۲۰۰۸ء میں اسے حاصل ہوا تھا۔

یہ وہ پس منظر ہے جس میں اس وقت میموسکینڈل نے غیر معمولی اہمیّت حاصل کر لی ہے۔ پھر اقتدار میں آنے کے بعد زرداری گیلانی حکومت نے جنرل پرویز مشرف کی وضع کردہ تمام

پالیسیوں کو جاری رکھا، حالانکہ قوم پہلے ہی دن سے ان پر ناخوش اور معترض تھی۔

یہی وہ چیز تھی جس نے امریکا کو یہ حوصلہ اور موقع دیا کہ اس نے افغانستان میں اپنے جنگی عزائم کو بروے کار لاکر سیاسی اور معاشی مفادات کے حصول کے لیے پاکستان کو ایک زینے کے طور پر استعمال کیا۔ یوں پاکستان کی آزادی، خودمختاری اور حاکمیت کو پارہ پارہ کیا اور پاکستان کے سیاسی، معاشی اور تعلیمی شعبوں، حتیٰ کہ نظریاتی دائرے میں بھی اس کا عمل دخل اتنا بڑھ گیا کہ بڑے پیمانے پر تعاون کے حاصل کرنے کے بعد اسے نچلی سطح تک تعاون حاصل کرنے کی ہمت ہوئی اور ہزاروں کی تعداد میں امریکی اہل کار (operators) پاکستان کی سرزمین پر سرگرم عمل ہوگئے۔ ریمنڈ ڈیوس کا واقعہ اس باب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ریمنڈ ڈیوس نے دو پاکستانی نوجوانوں کو گولیاں مارکر اور اس کے سرپرستوں نے ایک پاکستانی شہری کو کار کے ذریعے شہید کر دیا۔ پھر حکومتی رضامندی، اور اعانت سے امریکی پوری دیدہ دلیری سے قاتل کو چھڑا کر لے گئے۔ اس سانحے نے عوام اور تمام ہی سیاسی اور دینی قوتوں کو بیدار کر دیا۔ اس سلسلے میں حکومت اور اس کی ایجنسیوں نے جو گھناؤنا کردار ادا کیا، اُس نے عوام کو زرداری گیلانی حکومت سے مکمل طور پر مایوس کر دیا اور امریکا کو یہ حوصلہ ہوا کہ وہ ۲مئی ۲۰۱۱ء کو ایبٹ آباد پر حملہ کر کے شیخ اسامہ بن لادن کے قتل کا ڈراما رچائے۔ تقریباً دو گھنٹے تک یہ عمل جاری رہا اور ایبٹ آباد کے تمام ہی باسی بچشم سر، اس فوجی آپریشن کا نظارہ کرتے رہے، لیکن فضائیہ، زمینی افواج اور دوسرے قانون نافذ کرنے والے اداروں اور پولیس کا کہیں بھی وجود نہ تھا۔

ستم بالاے ستم یہ کہ اگلے ہی دن صدر زرداری کا مضمون واشنگٹن پوسٹ میں شائع ہوا مگر اس میں ایبٹ آباد پر امریکی حملے کے خلاف مذمت کا ایک لفظ بھی موجود نہ تھا، بلکہ اس آپریشن کو ایک مشترک کارنامہ قرار دینے کی کوشش کی گئی۔ وزیراعظم گیلانی نے پاکستانی سرزمین پر امریکی حملے اور پاکستانی زمین پر موجود افراد کو (جو کوئی بھی ہو) قتل کرنے کے اس جُرم کو 'ایک فتح' قرار دیا۔ وزارتِ خارجہ کا پہلا بیان نہایت بودا اور شرم ناک تھا اور پیپلز پارٹی کے دو بڑے وکیلوں (یعنی امریکا میں ان کے سفیر جناب حسین حقانی اور برطانیہ میں ان کے ہائی کمیشن واجد شمس الحسن صاحب) نے نہ صرف اس واقعے پر امریکا کو اشیر باد دی بلکہ اس میں پاکستان کے تعاون کا ذلت آمیز

دعویٰ بھی کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی حکومت اپنی دستوری ذمہ داری کو ادا کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہی اور امریکا کے اس دھڑلے سے حملے پر تمام ایجنسیاں، ادارے اور ملک کی سرحدوں اور حاکمیت کا دفاع کرنے والی قوتیں محض تماشائی کا کردار ادا کرنے اور اپنے فرائض منصبی کی ادایگی سے یکسر قاصر رہیں۔ اس چیز نے بڑے بنیادی سوالات کو جنم دیا۔

امریکا کی دل چسپی شیخ اسامہ یا القاعدہ میں تھی لیکن اب تک یہ امر غیر ثابت شدہ ہے کہ اسامہ بن لادن واقعی ایبٹ آباد کے اس مکان میں موجود تھے جس پر امریکی فوجوں نے حملہ کیا، اور چار افراد کو قتل کرکے ایک لاش اپنے ساتھ لے کر دندناتے ہوئے واپس چلے گئے۔ اس واقعے میں پاکستان کے لیے اصل اہمیت جس سوال کی ہے وہ یہ ہے کہ امریکا نے کس طرح اس جرأت و بے باکی کے ساتھ ہماری حاکمیت اور سرحدوں کے تقدس کو پامال کیا، ہماری سرزمین پر چار افراد کو کسی قانونی استحقاق، اور قانون کے مسلّمہ ضابطے کو تار تار کرکے اور ہماری حاکمیت کو پامال کرتے ہوئے بڑی بے دردی سے قتل کیا۔ ہمارے نزدیک یہ کم از کم تین حیثیتوں سے ایک جرمِ عظیم ہے:

۱- پاکستان کی حاکمیت اور علاقائی سالمیت کی خلاف ورزی۔

۲- اقوام متحدہ کے چارٹر اور جنیوا کنونشن کی کھلی کھلی خلاف ورزی۔

۳- اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے افغانستان میں دہشت گردی کے مقابلے کے لیے جو بھی لولا لنگڑا اختیار امریکا اور ناٹو کو دیا تھا، یہ اس کی بھی کھلی کھلی خلاف ورزی ہے کہ یہ اقدام افغانستان کے باہر فوجی آپریشن کے ذریعے کیا گیا ہے۔

ان تین قانونی اور سیاسی وجوہ کے علاوہ ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ امریکا ہمیں اپنا نان ناٹو اتحادی قرار دیتا رہا ہے اور کم از کم پچھلے ۱۰ سال سے اسٹرے ٹیجک پارٹنر ہونے کا دعویٰ بھی کرتا ہے۔ لیکن ایک اتحادی، دوست اور رفیق کار کے خلاف اس قسم کی فوج کشی اور وہ بھی اس سینہ زوری کے ساتھ، اس نے امریکا سے ہمارے پورے تعلّق کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ پاکستانی عوام ہی نہیں دنیا بھر کے انسانوں نے امریکا کو نہ صرف یہ کہ دوست ملک نہیں سمجھا ہے بلکہ خود امریکی اداروں کے تحت عوامی راے جاننے کے لیے جو سروے کرائے گئے ان کے مطابق تیسری دنیا کی اکثریت نے امریکا کو دوست نہیں قرار دیا۔ یہ ناراضی اور بے زاری امریکا کی سامراجی پالیسیوں کی

وجہ سے ہے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے یہاں امریکا کی پالیسیوں اور اس کی کارروائیوں کی تائید کرنے والے صرف ۷ فی صد ہیں، جب کہ ۹۳ فی صد نے امریکا کی پالیسیوں اور اس کے کردار کی یا پُرزور مذمت کی ہے یا وہ امریکا سے بے زاری کا اظہار کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ پاکستانی عوام کو کبھی بھی امریکا کی دوستی پر اعتماد نہیں تھا۔ یہ صرف حکمران تھے جنھوں نے عوام کے جذبات کے علی الرغم امریکا سے دوستی کا رشتہ استوار کیا اور اس کے ہر حکم پر سرِتسلیم خم کیا، لیکن اب وہ لمحہ آ گیا جب خود ان کے لیے بھی یہ حملہ ایک شرم ناک تازیانے سے کم نہ تھا۔

۲مئی کے واقعے پر ایک کمیشن قائم کر دیا گیا۔ یہ کمیشن چار ماہ سے اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لے رہا ہے۔ عوام یہ توقع رکھتے ہیں کہ کمیشن حقائق کی پردہ پوشی نہیں کرے گا۔ قوم اور پارلیمنٹ کو تمام حقائق سے آگاہ کرے گا اور دوٹوک انداز میں ان تینوں سوالوں کے جواب فراہم کرے گا کہ جو کچھ ہوا، وہ کیا تھا؟ بروقت اس پر ردِّعمل نہ ہونے کے اسباب کیا ہیں؟ اور سب سے بڑھ کر جو کچھ ہوا وہ کیوں ہوا، اور یہ کہ کس طرح اس کا تعلق نام نہاد 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' میں پاکستان کے شریک کار ہونے سے ہے؟ اس لیے کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ اس شرکت کے نتیجے میں نہ صرف دوسروں کی جنگ ہم پر مسلط ہوئی بلکہ اس جنگ میں سب سے زیادہ نقصان وہ پاکستانی قوم برداشت کر رہی ہے جس کا نائن الیون کے مذموم واقعے سے دُور و نزدیک کا بھی کوئی تعلق نہ تھا۔ سرکاری اعلانات اس امر پر شاہد ہیں کہ ۳۶ ہزار عام پاکستانی شہری اور ۶ سے ۱۰ ہزار فوجی یا فرنٹیر کور اور پولیس کے افراد لقمۂ اجل بن چکے ہیں۔ پاکستان کی سرزمین دہشت گردوں کی آماج گاہ بن گئی ہے جس کے نتیجے میں ملک کے طول و عرض میں جان و مال کا تحفظ باقی نہیں رہا۔ وہ فوج جس سے عوام محبت کرتے تھے اور جسے اپنی آزادی اور عزت کا محافظ سمجھتے تھے، اس کے اور عوام کے درمیان دُوریاں بڑھ گئی ہیں۔ شکاگو یونی ورسٹی کے پروفیسر رابرٹ پاپ (Robert Pape) نے اپنی تازہ ترین کتاب *Cutting the Fuse* میں جہاں افغانستان اور عراق کو امریکا کے مقبوضہ ممالک قرار دیا ہے، وہیں پاکستان پر ایک باب لکھا ہے۔ پاکستان کو بطور مثال امریکا کے بالواسطہ مقبوضہ (Indirect Occupied) ملک کے طور پر پیش کیا ہے جو نہ صرف باعثِ شرم ہے بلکہ ہماری آزادی کو عملاً غلامی میں تبدیل کیے جانے کے مترادف ہے۔

اس جنگ میں شرکت کے نتیجے میں جو معاشی تباہی آئی ہے وہ ہر اندازے سے کہیں زیادہ ہے۔ وزارتِ خزانہ، امریکا سے ملنے والی ۵/ارب ڈالر کی امداد کے مقابلے میں نقصان کو ۶۷/ارب ڈالر قرار دیتی ہے لیکن اس میں انسانی جانوں کے اتلاف، زخمیوں کی دیکھ بھال کے معاشی مصارف اور پورے ملک میں انفراسٹرکچر میں جو سیکڑوں ارب روپے کا نقصان (wear & tear) ہوا اس کا ایک پیسہ بھی شامل نہیں ہے۔ اگر ان تمام چیزوں کو معاشی نقصان کی شکل میں شمار کیا جائے تو اس تباہی کی معاشی قیمت ۱۰۰ سے ۱۵۰ ارب ڈالر سے کم نہیں ہوسکتی جو ہماری پوری سالانہ قومی پیداوار کے قریب قریب ہے۔ اس سب کے باوجود ۲مئی کو امریکا کی ہوائی افواج نے پاکستان کی مقدس سرزمین پر حملہ کیا، اور پھر ۲۶ نومبر کو ایک دوسرا بڑا حملہ ہوا، جس کے نتیجے میں ہماری دو فوجی چوکیاں تباہ کر دی گئیں۔ ۲۴ جوانوں کو شہید کر دیا گیا، ۱۷ زخمی ہوئے اور پورے دو گھنٹے تک امریکی ہیلی کاپٹر میزائلوں کی بارش کرتے رہے اور ان ہیلی کاپٹروں کو تحفظ دینے کے لیے ایف-۱۶ طیارے فضا میں موجود رہے۔ امریکا کے اس اقدام کو بین الاقوامی قانون میں Act of War کے علاوہ کسی اور لفظ سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ یہ امریکی جارحیت اتنی گھناؤنی اور خوف ناک تھی کہ فوج اور حکومت بھی خوابِ غفلت سے بیدار ہونے پر مجبور ہوئی اور عوامی دباؤ کے تحت حکومت کو تین اقدام کرنے پڑے، یعنی پاکستانی سرزمین پر ناٹو اور امریکیوں کے لیے ساز و سامان اور اشیاے ضرورت کی سپلائی کے لیے راہ داری کے حقوق کو معطل کرنا، شمسی ایربیس کو خالی کرانا، اور بون کانفرنس میں عدم شرکت۔ بلاشبہہ یہ اقدام عوام کی خواہشات کے مطابق اور ان کے غم و غصّے کو کسی حد تک کم کرنے کا باعث ہوئے لیکن یہ وقتی اقدام ہیں، اہم ترین مسائل کچھ اور ہیں جن کا قوم، پارلیمنٹ اور سیاسی و عسکری قیادت کو دوٹوک انداز میں سامنا کرنا ہوگا، وہ مسائل یہ ہیں:

امریکا کی مسلط کردہ 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' سے پاکستان کو جلد از جلد نکالنا اور اس سلسلے میں امریکا جو سامراجی اور خونیں کھیل اس علاقے میں کھیل رہا ہے اور اس میں پاکستان کو بطور ایک کارندے کے استعمال کر رہا ہے، اس سے مکمل طور پر اپنے کو علیحدہ (delink) کرنا ہے۔ دوسرے یہ کہ کھلے ذہن کے ساتھ اور آنکھیں بھی پوری طرح کھلی رکھ کر امریکا سے ایک آزاد اور خودمختار ملک کی حیثیت سے سفارتی و اقتصادی روابط اور تعلقات استوار کیے جائیں، البتہ اس کی

بنیاد حقائق پر ہونی چاہیے۔ محض خوف، خواہشات اور غلط فہمیوں کی بنیاد پر جو پالیسی بنتی ہے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ بلاشبہہ امریکا اور پاکستان میں جو طاقت کا عدم توازن ہے وہ ایک زمینی حقیقت ہے اور اسے کوئی نظرانداز نہیں کرسکتا۔ لیکن یہ اس سے بھی بڑی ایک حقیقت ہے کہ پاکستان ایک آزاد ملک ہے اور الحمدللہ ایک نیوکلیر پاور بھی ہے۔ جہاں یہ ضروری ہے کہ دوسروں کے حقوق کو پامال نہ کیا جائے، وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ کسی قیمت پر اور کسی بھی شکل میں خود اپنے حقوق اور مفادات کو پامال نہ ہونے دیا جائے اور ان کی مکمل حفاظت کی جائے۔

ان تمام نقصانات کے علاوہ جن کا ذکر اُوپر ہوا ہے امریکا نے کم از کم تین حیثیتوں سے پاکستان کی آزادی، خودمختاری، حاکمیت اور سلامتی کو نقصان پہنچایا ہے اور مستقبل میں تعلقات کی جو شکل بھی مرتب کی جائے، اس میں ان تینوں اُمور کے بارے میں دو اور دو چار کی طرح یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ ان میں امریکا کی مداخلت کسی صورت اور کسی حیثیت میں قبول نہیں کی جاسکتی:

۱- پاکستان کی آزادی اور حاکمیت اور پالیسی سازی کا غیرمشروط اختیار۔ بلاشبہہ جن امور کے بارے میں ہمارے اور امریکا کے سیاسی اور معاشی مقاصد اور اسٹرے ٹیجک مفادات مشترک ہوں، وہاں باوقار تعاون کا راستہ اختیار کیا جاسکتا ہے، اور جہاں اُن میں اختلاف ہے، وہاں ہماری اوّلین ترجیح اپنے مقاصد کا حصول اور اپنے مفادات کا تحفظ ہے۔ اس میں کسی قسم کی کوئی گنجایش نہیں ہونی چاہیے کہ ہمارے ان مقاصد اور مفادات پر امریکا یا کسی اور کی طرف سے کوئی آنچ بھی آسکے۔

۲- کسی بھی شکل میں پاکستان کی جغرافیائی، زمینی اور فضائی حدود کی خلاف ورزی ناقابلِ برداشت ہے۔ امریکی فوجیوں کو زمینی اور فضائی حدود کی خلاف ورزی (بشمول ڈرون حملوں) کی اجازت نہ ہوگی۔ اسی طرح پاکستان کی سرزمین پر امریکی جاسوسوں، فوجیوں یا دوسرے کارندوں کی موجودگی اور خفیہ آپریشن کا مکمل خاتمہ کرنا ہوگا۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ ویزے اور نگرانی کے نظام کو مؤثر بنایا جائے۔ پاکستان کی سرزمین پر جو محفوظ سازشی اڈے امریکیوں نے سفارت کاری کے نام پر یا کسی دوسری شکل میں قائم کیے ہوئے ہیں، ان کو بھی مکمل طور پر ختم ہونا چاہیے، اور ان کے سفارت خانوں اور سفارت کاروں کو بھی صرف وہی سہولتیں حاصل ہوں جن کی گنجایش ویانا کنونشن میں دی گئی ہے۔

۳- اس وقت ملٹری اور سول امداد کے نام پر امریکا پر انحصار بلکہ اس کی محتاجی کی جو کیفیت ہے اس پر ازسرِنو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان کی آزادی اور سلامتی کے تحفظ کے لیے 'ایڈ' (aid) کی خطرناک خوراک کو بند کرنا ضروری ہے۔ پاکستان کی جو بھی دفاعی ضروریات ہیں وہ عالمی منڈی بشمول امریکا سے پوری کی جاسکتی ہیں۔ جہاں تک امریکی معاشی امداد کا تعلّق ہے اس سے مکمل طور پر معذرت کر لی جائے۔ جیسا کہ ہیلری کلنٹن نے اپنی پاکستان یاترا کے دوران اشارہ دیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ معاشی امداد سرتاسر ایک نقصان کا سودا ہے۔ نیویارک ریویو آف بکس (۲۹ستمبر ۲۰۱۱ء) کے ایک مضمون میں امریکا ہی کے ایک آزاد ادارے سنٹرل گلوبل ڈویلپمنٹ (Central Global Development) کے ایک تجزیے کے مطابق گذشتہ نو برس میں پاکستان میں جو معاشی امداد آئی ہے وہ صرف ۳ء۴/ارب ڈالر ہے، دوسرے لفظوں میں ۴۸۰ ملین ڈالر سالانہ تھی۔ اسے پاکستان کی ۱۸ کروڑ آبادی پر تقسیم کیا جائے تو سالانہ ۶۷ء۲ ڈالر فی کس بنتی ہے۔ نیویارک ریویو آف بکس کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

> یہ لاہور میں چھے انچ کے پیزا کی قیمت ہے جس پر پیزا ہٹ کی طرف سے کوئی اضافی topping بھی نہیں دی جاتی۔

یہ ہے اس معاشی امداد کی حقیقت جس کے نتیجے میں ہمارے ہاتھوں میں امریکا کی ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئی ہیں۔ اس کے مقابلے میں جو راہ داری کی سہولتیں امریکا اور ناٹو کو گذشتہ ۱۰ برسوں میں حاصل رہی ہیں اگر دنیا کے معروف قاعدے کے مطابق ان پر راہ داری ٹیکس لگایا جاتا اور انھیں ٹیکس اور کسٹم سے مکمل استثنیٰ نہ دیا گیا ہوتا، تو کم از کم ۴ سے ۵/ارب ڈالر سالانہ صرف سروس چارجز کی شکل میں وصول کیے جاسکتے تھے۔ ترکی نے non-lethal سامان کی راہ داری کے لیے ۶/ارب ڈالر سالانہ اسی امریکا سے وصول کیے ہیں، جس کو ہم نے یہ ساری سہولتیں مفت دے رکھی ہیں۔ اس سے بڑی قومی مفاد سے غداری اور کیا ہوسکتی ہے۔ ایک طرف یہ ڈھائی ڈالر فی کس کی امداد ہے جس کے ساتھ سیکڑوں شرائط بھی لگائی گئی ہیں اور جسے بالعموم اپنی خود پسند این جی اوز کے ذریعے ملک میں اپنی لابی بنانے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنے مقاصد کو حاصل کرنے

کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف اگر ہم اس ۴۸۰ ملین ڈالر سالانہ کا مقابلہ پاکستانیوں کی ان ترسیلات سے کریں جو وہ اپنے ملک میں بھیج رہے ہیں تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ اس وقت یہ ترسیلات ۱۱/ارب ڈالر سالانہ ہیں لیکن افسوس کہ ان کو بھی صحیح انداز میں دیرپا معاشی ترقی کے حصول اور خوش حالی کے لیے استعمال نہیں کیا جارہا۔ آیندہ امریکا سے دوطرفہ تعلقات میں یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ امریکا سے تمام معاملات تجارتی اور سفارتی بنیادوں پر دونوں ممالک کے مشترک مفادات کی روشنی میں استوار کیے جائیں گے، اور جو یک طرفہ کھیل امریکا کھیل رہا ہے اس کا باب اب بند ہونا چاہیے۔

امریکا اور ناٹو کو راہ داری کا جو حق دیا گیا ہے اس کو ہرگز اس وقت تک بحال نہ کیا جائے جب تک کہ امریکا سے تعلقات کا نیا فریم ورک طے نہ ہو جائے۔ نیز ہر چیز ضبطِ تحریر میں لائی جائے اور قوم اور پارلیمنٹ کو مکمل اعتماد میں لیا جائے۔ اس کے بعد تجارت اور خود راہ داری کے معاملات پر بھی غور کیا جاسکتا ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ دنیا کے معروف قوانین اور ضوابط کے مطابق جو بھی سامان پاکستان کی سرزمین سے بھیجا جائے اس کی اسکریننگ ہو اور اس میں کوئی ایسی چیز نہ بھیجی جائے جو پاکستان کے قانون یا مفاد کے خلاف ہو، نیز پاکستانی سرزمین پر اس کا کنٹرول پاکستانی اداروں کے ہاتھ میں ہو تاکہ اسمگلنگ اور اسلحے کے ناجائز پھیلاؤ کو روکا جاسکے، اور راہ داری کی اس سہولت پر دنیا کے معروف ضابطوں کی روشنی میں مکمل سروس چارجز اور ٹیکس وصول کیا جائے۔

۲مئی، ۲۲مئی اور ۲۶ نومبر کے واقعات اس بات کا کھلا ثبوت ہیں کہ ہمارا انٹیلی جنس اور دفاع دونوں کا نظام نہایت خام اور نامکمل ہے۔ ہم کوئی راز فاش نہیں کر رہے ہیں جب ہم یہ کہتے ہیں کہ پاکستانی فضائیہ کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ اور سول ایوی ایشن دونوں کا نظام ہر لمحے اتنا چوکس ہونا چاہیے کہ پاکستان کی فضائی حدود میں اگر کوئی بھی داخل ہو، خواہ دوست ہو یا دشمن (hostile) تو دو منٹ کے اندر انھیں معلوم ہوجائے کہ ہماری حدود میں کوئی داخل ہوا ہے اور پھر مناسب وارننگ کے بعد اگر یہ دشمنی پر مبنی دراندازی ہے تو اس کا مقابلہ کیا جاسکے۔

اس کے لیے تین قسم کے نظام وضع کیے گئے تھے۔ ان میں ایک electro magnatic pulse تھا جس کے لیے پورے ملک کو مختلف سیکٹر میں بانٹ کر ریڈار کا نظام نصب کیا گیا تھا۔

دوسرا مینول مانٹیرنگ نظام تھا جس کے لیے ہر ساڑھے سات کلومیٹر پر ایک انسانی انتظام ایسی دُوربینوں کے ساتھ، جو تقریباً تین کلومیٹر تک دیکھ سکتی ہوں تاکہ پورے بارڈر کی نگرانی کی جاسکے۔ تیسرا نظام ریڈیو مانٹیرنگ کا تھا۔ اس امر کے بے لاگ جائزے کی ضرورت ہے کہ یہ تینوں نظام افغان سرحد پر کیوں غیر مؤثر رہے اور اس سلسلے میں جو بھی افراد فرض کی عدم ادایگی کے مرتکب ہوئے ہیں ان کا تعین اور ان کو قرار واقعی سزا ملنی چاہیے تاکہ آیندہ کے لیے ایسی کوتاہی (lapse) نہ ہو۔ یہ بات بہت ہی حیران کن ہے کہ ۲مئی کی کوتاہی کے بعد ۲۶ نومبر کو بھی اسی قسم کی کوتاہی کا ارتکاب کیا گیا جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ان چھے مہینوں میں دفاعی حوالے سے فضائی نگرانی کے نظام میں کوئی جوہری بہتری نہیں کی گئی۔ اس کی بھی جواب دہی ضروری ہے۔

ایک آخری بات جو ہم قوم اور قیادت دونوں کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں، وہ ہے جس کا تعلّق اُس بدنامِ زمانہ میمورنڈم سے ہے جو اس وقت پوری قوم، میڈیا، پارلیمانی کمیٹی براے قومی سلامتی اور سپریم کورٹ، ہر جگہ زیربحث ہے۔ یہ میمو ۲مئی کے واقعے کے فوراً بعد تیار کیا گیا ہے اور بظاہر اس کا پس منظر یہ ہے کہ فوج، سول حکومت کا دائرہ تنگ کر رہی ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لیے اس امر کی فوری ضرورت ہے کہ امریکی قیادت پاکستان کی فوجی قیادت کو لگام دے اور اسے مجبُور کرے کہ وہ سول قیادت کے حسبِ منشا کام کرے۔

بظاہر اس میمو کی تیاری میں مرکزی کردار امریکا میں پاکستان کے سابق سفیر اور منصور اعجاز نے ادا کیا ہے، جو ایک پاکستانی نژاد امریکی شہری ہے جس کے والد مذہباً قادیانی تھے اور پاکستان کے نیوکلیئر اسٹیبلشمنٹ سے وابستہ تھے۔ منصور اعجاز نے گذشتہ ۱۵/۲۰ برس میں ایک طرف بزنس مین کی حیثیت سے کافی دولت کمائی اور دوسری طرف امریکا کی اہم شخصیات بشمول سی آئی اے اور امریکا کی فوجی اور سیاسی قیادت سے اس کے مراسم تھے اور بزعمِ خود بیک چینل ڈپلومیسی میں بھارت، پاکستان، سوڈان اور متعدد ممالک کے سلسلے میں خدمات انجام دی ہیں۔ منصور اعجاز کس کردار کا شخص ہے یہ ہمارے لیے اتنا اہم نہیں جتنا میمو اور اس کے مندرجات کا مسئلہ اہم ہے۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ میمو ایک حقیقت ہے اور یہ بھی ناقابلِ تردید امر ہے کہ یہ میمو جنرل جونز کے ذریعے

اس وقت کے چیف آف اسٹاف ایڈمرل مولن کے ہاتھوں میں پہنچا۔ البتہ جو چیز تحقیق طلب ہے، وہ یہ ہے کہ اس میمورنڈم کے تصور کا آغاز کہاں سے ہوا اور فی الحقیقت کون سی شخصیت یا ادارہ ہے جو اس کے پیچھے ہے، اور دوسری طرف اس کا اصل مقصد کیا ہے؟ تیسری بات یہ کہ اس وقت اس کی اشاعت کن مقاصد کے تحت ہوئی اور کون نشانہ ہے؟

یہ بات بھی ایک مسلّمہ امر ہے کہ میمو کا تعلّق ۲مئی کے واقعے اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والے حالات سے ہے۔ اسی طرح ۳مئی کا صدر زرداری کا واشنگٹن پوسٹ میں شائع ہونے والا مضمون، اس کے بعد میمو کی اشاعت، آئی ایس آئی کے سربراہ کی منصور اعجاز سے ملاقات، چیف آف اسٹاف کی صدر اور وزیراعظم سے ملاقات اور اس پر اصرار کہ معاملے کی تحقیق کی جائے اور حسین حقانی کو بلایا جائے ___ یہ سب بھی حقائق ہیں۔ ابتدا میں جنرل مولن نے میمو سے انکار کیا لیکن پھر منصور اعجاز کے ای میل اور ایس ایم ایس اور دوسرے شواہد کے اعلان کے بعد، میمو کے صحیح ہونے کا اعتراف کرلیا۔ جنرل جونز کے تین بیان قابلِ توجہ ہیں: پہلے بیان میں اعتراف کیا گیا کہ میمو ملا تھا اور ایڈمرل مولن کو بھیجا گیا تھا۔ امریکا کے ایک ٹی وی چینل پر اپنے دوسرے بیان میں انھوں نے تفصیلی اعتراف کیا۔ پھر سپریم کورٹ کے سامنے حسین حقانی کی صفائی کے لیے حلفیہ بیان داخل کر دیا جو اُن کا تیسرا بیان تھا۔ ان تینوں بیانات میں تضادات ہیں اور منصور اعجاز نے جونز سے اپنے تعلقات اور بات چیت کا جو ریکارڈ پیش کیا ہے اس سے خود جنرل جونز کا کردار خاصا مشکوک ہوگیا ہے، اور صاف نظر آرہا ہے کہ حسین حقانی کو بچانے کے لیے وہ سرتوڑ کوشش کر رہا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے اس امر پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ خود میمو میں کیا کہا گیا ہے؟ اس میمو کا موقع محل اور پس منظر یہ ہے کہ یہ ۲مئی کے پس منظر میں لکھا گیا۔ اس سیناریو میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ پاکستانی فوج ایک طرف پریشانی اور ہزیمت کا شکار ہے تو دوسری طرف وہ اپنے اثرورسوخ اور کردار کو بچانے کے لیے سول حکومت کے خلاف کوئی کارروائی کرنے والی ہے۔ میمو کا مقصد یہ ہے کہ پاکستان کی سول حکومت خصوصیّت سے صدر زرداری جمہوریت کی بقا کے نام پر امریکی چیف آف سٹاف اور اعلیٰ امریکی قیادت کی مدد حاصل کرنا چاہتے ہیں تاکہ فوج کو قابو میں کیا جاسکے اور اس کے دانت اس حد تک توڑ دیے جائیں کہ وہ پورے طور پر بظاہر سیاسی

قیادت کے تابع ہو جائے، لیکن فی الحقیقت اس کو ایک ایسے مقام پر لے آیا جائے جو علاقے میں امریکی مقاصد اور اہداف کے حصول میں معاون ہو سکے۔ دوسرے لفظوں میں سول حکومت اور امریکا کے درمیان ایک نئے گٹھ جوڑ کا اہتمام کیا جائے اور ماضی میں امریکا اور فوج کا بلاواسطہ جو تعلّق رہا ہے اُسے اس طرح نئے سانچے میں ڈھالا جائے کہ امریکا اور پاکستان کی سیاسی قیادت مل کر فوج کو قابو میں کر سکے۔

امریکا کو ضمانت دی گئی کہ اگر وہ میمورنڈم میں بنیادی کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہو تو صدرمملکت اس بات کا وعدہ کرتے ہیں کہ دفاع اور سیکورٹی کا پورا نظام امریکا کی منشا کے مطابق ازسرِنو مرتب کیا جائے گا اور واشنگٹن کی پسند کے افراد کو فوج اور انٹیلی جنس اداروں کی ذمہ داری سونپی جائے گی۔ امریکا کے خدشات کی روشنی میں پاکستان کے نیوکلیئر اثاثوں کی نگرانی کا طریق کار بھی ازسرِنو طے کیا جائے گا۔ دہشت گردی کے خلاف امریکا کی جنگ کے سلسلے میں فوج اور انٹیلی جنس کے بارے میں امریکی تحفظات کو دُور کیا جائے گا۔ بھارت سے معاملات کو امریکی حکمت عملی کے مطابق مرتب کیا جائے گا، اور آئی ایس آئی کو اس طرح قابو کیا جائے گا کہ اس کی وہ شاخیں جن کے بارے میں امریکا کو شبہہ ہے کہ وہ امریکی مقاصد کے حصول کی راہ میں رکاوٹ ہیں، انھیں ختم کر دیا جائے گا۔ نیز اس کے اُس ونگ کو ختم کیا جائے گا جس کے بارے میں حکومت اور امریکا دونوں متفکر ہیں۔

اس میمو کے تجزیے سے تین باتیں سامنے آتی ہیں:

۱- پاکستان کے سیکورٹی معاملات میں امریکا کو کھلی مداخلت کی دعوت۔

۲-سول قیادت کا امریکا کے ساتھ ایک نیا عہد و پیمان اور امریکی مفادات کے تحفظ کی ضمانت۔

۳-ملکی سلامتی، آزادی اور حاکمیت کے باب میں پاکستان کے آزادانہ سیاسی، عسکری کردار کا خاتمہ اور امریکی ایجنڈے کی تکمیل کی ضمانت۔

اس طرح یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ میمو محض کاغذ کا پُرزہ نہیں (جیسا کہ گیلانی صاحب نے دعویٰ کیا ہے) بلکہ یہ تو ایک 'میثاقِ غلامی' ہے، اور اس کا مضمون سوچنے، اُسے لکھنے اور اسے پہنچانے والوں نے وہی کردار ادا کیا ہے جو تاریخ میں میر جعفر اور میر صادق ادا کرتے رہے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اصل کرداروں کا تعیّن کیا جائے اور پھر انھیں اپنے دفاع کا پورا موقع دیا جائے۔

اس کے بعد، اگر ان کا جرم ثابت ہو تو انھیں عبرت ناک سزا دی جائے۔ یہ کام پارلیمانی کمیٹی نہیں کرسکتی صرف عدالت کرسکتی ہے۔ بلاشبہہ عدالت کے لیے ضروری ہے کہ وہ بھی فرنسک (forensic) تحقیق اور مناسب بحث و تفتیش کے بعد اور عدل کے تقاضے پورے کرتے ہوئے فیصلہ کرے۔ یہ مسئلہ بہرحال ایسا نہیں کہ اس کو سیاسی مصلحتوں یا 'مُک مُکے' کی کسی شکل کا سہارا لے کر داخلِ دفتر کر دیا جائے۔

ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ کون قابلِ اعتماد ہے اور کس کا ماضی میں کیا کردار رہا ہے؟ ہمیں اس بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں کہ منصور اعجاز پاکستان کا دوست ہے۔ بلاشبہہ اس کا ماضی بتاتا ہے کہ وہ امریکا کا وفادار ہے اور جو کردار وہ ادا کر رہا ہے وہ امریکا کے مفاد میں ہے۔ اسے پاکستان سے کوئی دل چسپی نہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ منصور اعجاز ماضی میں پاکستان، پاکستانی فوج اور آئی ایس آئی کے خلاف بہت کچھ لکھتا رہا اور کہتا رہا ہے لیکن اس معاملے میں حسین حقانی صاحب بھی اس سے پیچھے نہیں رہے۔ ان کی کتاب *Pakistan between Mosque & Military* ان کے اپنے خیالات کا آئینہ ہے۔ یہ ایک ایسی دستاویز ہے جس کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس باب میں ان کے اور منصور اعجاز کے خیالات میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ دونوں انگریزی محاورے میں ایک ہی صفحے پر نظر آتے ہیں (on the same page)۔ بہرحال میمو کی تحقیق و تفتیش معروف ضابطوں کے مطابق پوری دیانت اور شفافیت کے ساتھ ہونی چاہیے تاکہ یہ بات کھل کر سامنے آجائے کہ کون سچ بول رہا ہے اور اس معاملے میں دونوں کا کیا کردار رہا ہے، نیز یہ بھی پتا چلے کہ اس معاملے میں اُن کے پیچھے کون سی قوتیں کارفرما تھیں۔ ہمارے نزدیک اس کے پانچ امکانات ہوسکتے ہیں:

اوّل: سارا کھیل صرف منصور اعجاز نے محض اپنے ذاتی مقاصد اور ذاتی شہرت اور کچھ سیاسی و مالی مفادات کی خاطر کھیلا ہے۔ بظاہر امکان نہیں ہے کہ وہ پاکستان سے کوئی فائدہ اُٹھا سکے۔ فائدہ اسے امریکا ہی سے ہوسکتا ہے جس سے وہ اپنی وفاداری اور تعلقات کا برملا اعلان کرتا ہے۔

دوم: دستاویزی اور تائیدی شہادتوں کی بنا پر قرینِ قیاس ہے کہ منصور اعجاز کو حسین حقانی نے (جس سے اس کے ۱۰ برسوں پر محیط تعلقات ہیں) اس کام کے لیے آمادہ کیا ہو۔ یوں پورے

معاملے میں یہ دونوں شریک ہوں۔ لیکن یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ کیا حسین حقانی بظاہر محض اپنے بل بوتے پر یہ کردار ادا کرسکتا ہے؟

سوم: میمو کی داخلی شہادت، منصور اعجاز کی ایس ایم ایس اور ای میل کا ریکارڈ اشارہ کرتا ہے کہ اس معاملے میں اس پردۂ زنگاری کے پیچھے کوئی اور ہے اور اشارہ صدرِ پاکستان جناب زرداری اور غالباً ایوانِ صدر کے ایک اور اعلیٰ افسر کی طرف ہے۔ اسے ہم حسین حقانی پلس کہہ سکتے ہیں اور اگر یہ صحیح ہے تو تعیّن ہونا چاہیے کہ اس کے پیچھے فی الحقیقت کون تھا؟ دوسرے الفاظ میں پورے معاملے کا بینی فشری، یعنی اصل فائدہ اٹھانے والا کون ہے؟

چہارم: کسی ایجنسی نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے منصور اعجاز کو ذریعہ بنایا ہو۔ منصور اعجاز، جنرل جونز اور ایڈمرل مولن یہ تین تو کھلے کھلے کردار بالکل سامنے آگئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے بیان کے مطابق اپنا اپنا کردار ادا کیا ہے، البتہ ان کے پیچھے کون ہے؟ کیا یہ کام سی آئی اے نے کرایا؟ یا اس میں موساد اور را کا بھی حصّہ ہے؟ اصل مقصد پاکستانی آئی ایس آئی اور فوج کی گوش مالی ہے جس کے خلاف امریکی میڈیا جارحانہ محاذ آرائی کرتا رہا ہے، اور یہ بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے تاکہ پاکستان اور اس کی فوج کو بلیک میل کیا جائے۔ کیا ان ایجنسیوں نے سارا کھیل کھیلا اور پاکستان کے سابق سفیر کو بھی اس میں استعمال کیا گیا___ ان کی مرضی سے یا ان کو بے وقوف بنا کر؟

پنجم: بظاہر ایک غیر اغلب امکان یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ اس پورے ڈرامے کے پیچھے پاکستانی انٹیلی جنس کا ہاتھ ہو، تاہم اس میں دو چیزیں اس مفروضے کو ناقابلِ التفات بتاتی ہیں۔ ایک یہ کہ منصور اعجاز اور آئی ایس آئی کا اس سازش میں شریک ہونا ممکن نہیں۔ دوسرے یہ کہ فوج اور آئی ایس آئی نے جو اسٹینڈ لیا ہے، جس طرح وہ معاملے کی تحقیق اور مجرموں کے تعیّن کے لیے اصرار کر رہی ہے، اس سے اس امکان کی تردید ہوتی ہے۔

ہمیں توقع ہے کہ سپریم کورٹ اور پارلیمانی کمیٹی براے قومی سلامتی ان تمام پہلوؤں کا دیانت داری اور عرق ریزی کے ساتھ جائزہ لے گی تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو۔ اصل حقائق قوم کے سامنے آئیں اور جس کا جو کردار ہے، اس کے مطابق معاملہ کیا جائے۔

صدر زرداری اور وزیراعظم گیلانی کا کردار بہت سے شکوک وشبہات کو جنم دینے والا ہے۔ منصور اعجاز کے مضمون کی اشاعت (۱۰/اکتوبر ۲۰۱۱ء) کے بعد حکومت کی مستقل خاموشی نے معاملے کو اور بھی گمبھیر بنادیا۔ جب پانی سر سے اُونچا ہوگیا تو تردیدی بیانات جاری کیے گئے مگر وہ نہایت مبہم تھے۔ بعدازاں حسین حقانی کو بلا کر ایک طرف تو ان سے استعفا لیا گیا اور دوسری طرف انھیں ایوانِ صدر اور ایوانِ وزیراعظم میں پناہ دی گئی ہے۔ مزید یہ کہ وزیراعظم گیلانی کا اچانک یہ اعلان کہ میمو میں کوئی حقیقت نہیں اور یہ فقط کاغذ کا پُرزہ ہے۔ وفاقی حکومت نے یہی موقف سپریم کورٹ کے سامنے اختیار کیا۔ اس کے برعکس چیف آف اسٹاف اور آئی ایس آئی کے ڈائرکٹر جنرل نے میمو کو ملک کی سلامتی کے خلاف ایک خطرناک سازش اور فوج کو بدنام کرنے اور اس کا مقام گرانے کی مذموم کوشش قرار دیا ہے۔

اگر میمو جھوٹ کا پلندا ہے تو پھر امریکا میں پاکستان کے سفیر سے استعفا کیوں لیا گیا؟ اگر تفتیش کے لیے ان سے استعفا لینا ضروری تھا تو صدر صاحب سے استعفا کیوں نہیں لیا گیا؟ اس معاملے میں ان کا نام بھی سرفہرست آتا ہے۔ بظاہر وہی اس پورے معاملے سے فائدہ اٹھانے والے نظر آتے ہیں۔ پیپلز پارٹی کی قیادت اور میڈیا کے بعض عناصر نے آئی ایس آئی کے چیف کے استعفے کی بات بھی کی ہے۔ یہ حقیقت نظرانداز کی جارہی ہے کہ میمو اگر صحیح ہے تو اس میں کلیدی کردار حسین حقانی اور صدر صاحب کا ہے۔ آئی ایس آئی کے چیف کے بارے میں جو بات ضمناً فون اور ای میل کے متن (transcript) میں کہی گئی ہے، وہ یہ ہے، منصور اعجاز کہتا ہے:

I was just informed by senior US intelligence that GD-SII Mr. P asked for, and received permission from senior Arab leaders a few days ago to sack Z. For what its worth.

امریکی خفیہ ایجنسی کے سینیر ذمہ دار نے ابھی مجھے بتایا کہ آئی ایس آئی کے ڈائرکٹر جنرل، مسٹر پی کو ایک ذمہ داری سونپی گئی جس کے تحت انھوں نے سینیر عرب لیڈروں سے چند دن قبل یہ اجازت حاصل کی کہ مسٹر زیڈ کو ان کے عہدے سے ہٹا دیا یا برطرف کردیا جائے۔ اب ان معلومات کی کیا قدروقیمت ہے وہ جو بھی ہو؟

اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ امریکی انٹیلی جنس کی بات ہے جو منصور اعجاز کو بتائی گئی اور

وہ خود بھی اس بارے میں شبہے میں مبتلا ہے جو یہ کہہ رہا ہے: for what its worth۔ اس کے برعکس حسین حقانی اور ان کے باس صاحب کا کردار کلیدی ہے جس کا کسی سنی سنائی بات سے تعلق نہیں ہے۔ اس طرح دونوں کو مساوی ذمہ دار قرار دینا عقل کا تقاضا نہیں ہے۔ اسی متن میں ایک مقام پر یہ بھی آتا ہے کہ منصور اعجاز نے یہ بات بھی کہی:

it is interesting and heartening to see that many of the proposals made in the memo are being implemented in bi-lateral relationship. very good.

یہ بات بہت دل چسپ ہے اور باعثِ مسرت بھی، کہ میمو کی بہت سی تجاویز پر دوطرفہ تعلقات کی روشنی میں عمل درآمد کیا جارہا ہے۔ بہت خوب!

اس جملے کی روشنی میں اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ امریکا اور پاکستان کی سیاسی قیادت کہاں تک یکساں سوچ رکھتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ میمو کا جو بھی ردِّعمل ہوا ہو اور مولن نے میمو کی تاریخ کے ایک ہفتے کے اندر، امریکی انٹیلی جنس کے سامنے پاکستانی فوج اور آئی ایس آئی کے خلاف بیان دیا، اگر اس کا رشتہ نہ بھی جوڑا جائے، تب بھی میمو کی اشاعت سے ظاہر ہوتا ہے کہ امریکی قیادت اور پاکستانی قیادت کے درمیان تعاون کا کوئی نہ کوئی سلسلہ کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ پارلیمانی کمیٹی اور سپریم کورٹ کو اس امر کو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔

میمو میں ایک اور بڑی اہم بات ہے جسے تحقیق کا محور ہونا چاہیے اور وہ یہ کہ ۲مئی کے واقعے کے سلسلے میں امریکا اور پاکستان کی قیادت کے درمیان کسی درپردہ تعاون اور سمجھوتے کا اشارہ ہے۔ حسب ذیل جملے کو غور سے پڑھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ منصور اعجاز لکھتا یا کہتا ہے:

By the way, I know a lot more than you give me credit for about the circumstances that led to May 1 and your role in that. Just FY1.

ویسے تو آپ نے مجھے ان حالات کے بارے میں جن باتوں کا سزاوار قرار دیا ہے جو یکم مئی☆ کے واقعات کا سبب بنی ہیں، اس سے زیادہ جانتا ہوں اور یہ بھی کہ ان میں خود آپ کا کیا کردار رہا ہے۔ بس FY1

☆ امریکا میں اس روز یکم مئی ہی تھا، مگر پاکستان میں ۲مئی شروع ہوچکا تھا۔

جس پر حسین حقانی کا جواب یہ تھا:

Honorable ppl stick with one another. Take care.

> عزت مآب 'P' براہِ کرم ڈٹے رہیے اور ایک دوسرے سے جڑے رہیے اور ذرا محتاط بھی رہیں۔

جب ہم اس جملے کو حسین حقانی اور واجد شمس الحسن کے ٹی وی بیانات کے ساتھ دیکھتے ہیں اور ساتھ ہی صدر صاحب کے ۳مئی کے مضمون (مطبوعہ: واشنگٹن پوسٹ) کو پڑھتے ہیں (جس میں حسین حقانی کے طرزِ تحریر کی صاف جھلک موجود ہے)، تو اس میں امریکا کی طرف سے پاکستان کی حاکمیت کی پامالی اور جغرافیائی حدود کی خلاف ورزی کے سلسلے میں مذمت کا ایک لفظ بھی نظر نہیں آتا، بلکہ دبے لفظوں میں پاکستان اور امریکا کے تعاون کا اشارہ دیا گیا ہے۔ یہاں زرداری صاحب کے دستِ راست جناب رحمٰن ملک کے ایک ٹی وی انٹرویو کا یہ تذکرہ بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ ہفت روزہ *Pulse* کا مضمون نگار لکھتا ہے:

> عبدالرحمٰن ملک نے العربیہ چینل کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا کہ ''آپریشن شروع ہوا تو ۱۵ منٹ بعد مجھے اس سے آگاہ کر دیا گیا تھا'' لیکن وزیرداخلہ امریکی افواج (SEALS) کے سامنے بے بس اور عاجز تھے۔ (ہفت روزہ *Pulse*، ۹-۱۵ دسمبر ۲۰۱۱ء، ص ۱۴)

یاد رہے کہ یہ آپریشن ۴۰ منٹ جاری رہا۔ اس کے بعد ۴۰ منٹ تک امریکی ہیلی کاپٹر پاکستانی حدود میں اُڑتے رہے۔ اگر وزیرداخلہ آپریشن کے آغاز سے ۱۵ منٹ کے بعد اس سے مطلع ہو چکے تھے تو پھر ایک گھنٹے تک وہ کیا کرتے رہے؟

ان سارے حقائق کی موجودگی میں پورے واقعے کو مذاق اور جھوٹ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ملک سے اس بے وفائی اور غداری میں کس کا کتنا ہاتھ ہے؟ اس کا تعیّن ہونا چاہیے، مگر پارلیمانی کمیٹی کا یہ کام نہیں کرسکتی کیوں کہ اس میں اکثریت پیپلز پارٹی اور اتحادیوں کی ہے۔ بلاشبہہ پارلیمانی کمیٹی کو اپنا کردار ضرور ادا کرنا چاہیے لیکن مسئلے کی صحیح اور غیر جانب دارانہ تحقیق اور ذمہ داری کا تعیّن صرف اعلیٰ ترین عدالت ہی کرسکتی ہے۔ پوری قوم اور تاریخ دونوں کی نگاہیں عدالت اور اس سے بے لاگ انصاف کی توقع پر لگی ہوئی ہیں۔

نفاذ اسلام میں حکمت

اس معاملے میں سب سے پہلی بات جو سمجھ لینی چاہیے وہ یہ ہے کہ جس چیز کا نام اسلامی نظام ہے وہ کسی بے ایمان اور بدکردار حکومت کے ہاتھوں سے نہیں چل سکتا۔ کوئی خدا سے بے خوف بیوروکریسی اسے نہیں چلا سکتی۔ کسی ایسی آبادی میں وہ ٹھیک طور پر نہیں چل سکتا جس کی اخلاقی حالت بالعموم خراب ہو اور خراب کی جاتی رہی ہو....

● **اسلام کا علم پھیلایا جائے:** اب اگر کوئی اسلامی حکومت قائم ہو تو یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ چھوٹتے ہی مثالی نظام کی طرف پلٹ جائے گی۔ آغازِ کار میں اگر کچھ ہوسکتا ہے تو وہ اس کے بغیر نہیں ہوسکتا کہ حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہو جو ملک کے تمام ذرائع و وسائل، ملک کے تمام ذرائعِ ابلاغ، ملک کے سارے نظامِ تعلیم، اور حکومت کی پوری انتظامی پالیسی کو اس غرض کے لیے استعمال کریں کہ مسلمانوں میں اسلام کا علم وسیع پیمانے پر پھیلایا جائے اور ان کی عام اخلاقی حالت کو درست کیا جائے۔ جس قدر اسلام کا علم پھیلے گا اور عام اخلاقی حالت درست ہوتی جائے گی اتنی ہی زمین اسلامی نظام کے لیے تیار ہوتی چلی جائے گی.... بے شک اسلامی قوانین کو نافذ کرنے کی کوشش کیجیے۔ قوانین اسلامی کو مدون بھی کیجیے تاکہ ہماری عدالتیں ان کے مطابق فیصلے کرسکیں، مگر بس یہی ایک کام ایسا نہیں ہے جس سے اسلامی نظام قائم ہو جائے۔

● **ذرائعِ ابلاغ کی اِصلاح:** سب سے زیادہ زور جس بات پر صَرف کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ ہمارے تمام ابتدائی اور ثانوی مدرسوں اور ہمارے تمام کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں اسلامی تعلیم دی جائے۔ ذرائعِ ابلاغ کو فحش اور بے حیائی، بداخلاقی اور جرائم پھیلانے کے بجائے مسلمانوں کو ایمان اور اسلامی عقائد سمجھانے اور ذہن نشین کرنے پر صَرف کیا جائے۔ عام لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ اسلامی اخلاق کیا ہیں اور کافرانہ اخلاق کیا، اور دونوں قسم کے اخلاقوں میں فرق کیا

ہے۔ پہلے میں بیان کر چکا ہوں کہ اسلامی نظام تو قائم ہی اس معاشرے میں ہوا تھا جس کے اندر سب سے پہلے ایمان کو مستحکم کیا گیا تھا، پھر اسی ایمان کی مضبوط بنیاد پر پورے اخلاقی نظام کی، پورے معاشرتی نظام کی، پورے معاشی نظام کی، پورے سیاسی نظام اور پورے قانونی نظام کی عمارت اُٹھائی گئی تھی۔ اب اگر ہم اس مثالی دَور کی طرف پلٹنا چاہتے ہیں تو ہمیں اسی ترتیب سے پلٹنا چاہیے۔

عام مسلمانوں کے دلوں میں اگر خدا پر ایمان، رسولؐ پر ایمان، قرآن پر ایمان اور آخرت پر ایمان مضبوطی کے ساتھ نہ بٹھایا گیا تو محض قوانین کو بدلنے سے کام نہ چلے گا.... اسلامی قانون صحیح طور پر کیسے نافذ ہوگا، جب کہ اس کو نافذ کرنے والی مشینری ہی بگڑی ہوئی ہے۔ قوانین اسلامی کے نفاذ کی تدبیریں کرنے کے ساتھ موجودہ حکومت کے لیے بھی اور آیندہ آنے والے حکمرانوں کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ ملک کی انتظامیہ کو بھی درست کریں۔ تعلیم کے نظام کی بھی اصلاح کریں اور ملک کے تمام ذرائع و وسائل کو اس بات پر صَرف کردیں کہ مسلمانوں کے دلوں میں ایمان بٹھایا جائے۔ ان کے اخلاق درست کیے جائیں اور ان کے اندر خدا کا خوف پیدا کیا جائے۔

● **راے عامہ کی ہمواری اور دباؤ**: اسلامی قانون میں ڈنڈے کا بھی ایک مقام ہے مگر وہ سب سے آخر میں آتا ہے۔ اسلام میں ترتیبِ کار یہ ہے کہ پہلے ذہنوں کی اصلاح کا کام تعلیم و تلقین کے ذریعے سے کیا جائے تاکہ لوگوں کے خیالات تبدیل ہوں۔ پھر لوگوں کے اندر اسلامی اخلاق پیدا کرنے کے لیے بڑے پیمانے پر کام کیا جائے۔ یہاں تک کہ محلّے محلّے، بستی بستی اور کوچے کوچے میں ایسے لوگ تیار ہوجائیں جو بدکرداروں کو عوام کی مدد سے دبائیں اور اپنے اپنے علاقے کے باشندوں میں دین داری اور دیانت داری پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اس طرح ملک کے اندر ایک ایسی راے عام پیدا ہوجائے گی جو بُرائیوں کو سر نہ اُٹھانے دے گی۔ کوئی شخص ایسی راے عام کی موجودگی میں بگڑنا چاہے گا تو اس کے راستے میں بے شمار رکاوٹیں پیدا ہوجائیں گی اور جو شخص صحیح طرزِ زندگی اختیار کرے گا اس کو پورا معاشرہ مدد دینے والا ہوگا۔

اس کے ساتھ اسلام یہ بھی چاہتا ہے کہ معاشرہ ایسا ہو جس کے لوگ ایک دوسرے کے ہمدرد اور غم گسار ہوں، ایک دوسرے کی مصیبت میں کام آنے والے ہوں۔ ہر شخص انصاف کا حامی اور بے انصافی کا مخالف ہو۔ ہر شخص اپنے اُوپر پیٹ بھرنا حرام سمجھے اگر اس کو معلوم ہو کہ اس کا

ہمسایہ بھوکا سو رہا ہے۔ پھر اسلام ایک ایسا معاشی نظام بھی قائم کرتا ہے جس میں سود حرام ہو، زکوٰۃ فرض ہو، حرام خوری کے دروازے بند کر دیے جائیں۔ رزقِ حلال کمانے کے لیے تمام مواقع لوگوں کے لیے کھول دیے جائیں اور کوئی آدمی اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہنے پائے۔ ان تدابیر کے بعد ڈنڈے کا مقام آتا ہے۔ ایمان، اخلاق، تعلیم، انصاف، اصلاح معیشت، اور ایک پاکیزہ راے عام کے دباؤ سے بھی جو آدمی درست نہ ہو تو وہ ڈنڈے ہی کا مستحق ہے۔ اور ڈنڈا پھر اس پر ایسی بے رحمی کے ساتھ علی الاعلان چلایا جائے کہ ان تمام لوگوں کے دماغ کا آپریشن ہو جائے جو جرائم کے رجحانات رکھتے ہوں۔

● **پہلے اِصلاح پھر سزا**: لوگ بڑا غضب کرتے ہیں کہ اسلام کے پروگرام کی ساری تفصیل چھوڑ کر صرف اس کی سخت سزاؤں پر گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ اسلام پہلے عام لوگوں میں ایمان پیدا کرتا ہے۔ پھر عوام کے اخلاق کو پاکیزہ بناتا ہے۔ پھر تمام تدابیر سے ایک ایسی مضبوط راے عام تیار کرتا ہے جس میں بھلائیاں پھلیں پھولیں اور بُرائیاں پنپ نہ سکیں۔ پھر ایسا معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام قائم کرتا ہے جس میں بدی کرنا مشکل اور نیکی کرنا آسان ہو جائے۔ وہ ان تمام دروازوں کو بند کر دیتا ہے جن سے فواحش اور جرائم نشوونما پاتے ہیں۔ اس کے بعد ڈنڈا وہ آخری چیز ہے جس سے ایک پاک معاشرے میں سر اُٹھانے والی ناپاکی کا قلع قمع کیا جاتا ہے۔ اب اس سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے کہ ایسے برحق نظام کو بدنام کرنے کے لیے آخری چیز کو پہلی چیز قرار دیتا ہے اور بیچ کی سب چیزوں کو ایمان کی طرح نِگل جاتا ہے۔

● **تبدیلی کا ذریعۂ انتخابات**: [سوال یہ ہے] کہ اس مغربی اندازِ انتخابات کو کس حد تک اسلام کے شورائی نظام سے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے اور کس طرح؟ یہ بات ذہن نشین کر لیجیے کہ ہم اس وقت جس مقام پر کھڑے ہیں اسی مقام سے ہمیں آگے چلنا ہوگا، اور جس منزل تک ہم جانا چاہتے ہیں اس کو واضح طور پر نگاہ کے سامنے رکھنا ہوگا تاکہ ہمارا ہر قدم اسی منزل کی طرف اُٹھے، خواہ ہم پسند کریں، یا نہ کریں۔ نقطۂ آغاز تو لامحالہ یہی انتخابات ہوں گے۔ کیونکہ ہمارے ہاں اسی طریقے سے نظامِ حکومت تبدیل ہو سکتا ہے اور حکمرانوں کو بھی بدلا جا سکتا ہے۔ کوئی دوسرا ذریعہ اس وقت ایسا موجود نہیں ہے جس سے ہم پُرامن طریقے سے نظامِ حکومت بدل سکیں اور حکومت

چلانے والوں کا انتخاب کر سکیں۔

اب ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہمارے ہاں انتخابات میں دھونس، دھوکے، دھاندلی، علاقائی، مذہبی یا برادری کے تعصّبات، جھوٹے پروپیگنڈے، گندگی اُچھالنے، ضمیر خریدنے، جعلی ووٹ بھگتانے اور بے ایمانی سے انتخابی نتائج بدلنے کے غلط طریقے استعمال نہ ہوسکیں۔ انتخابات دیانت دارانہ ہوں، لوگوں کو اپنی آزاد مرضی سے اپنے نمایندے منتخب کرنے کا موقع دیا جائے۔ پارٹیاں اور اشخاص جو بھی انتخابات میں کھڑے ہوں، وہ معقول طریقے سے لوگوں کے سامنے اپنے اصول، مقاصد اور پروگرام پیش کریں، اور یہ بات ان کی اپنی رائے پر چھوڑ دیں کہ وہ کسے پسند کرتے ہیں اور کسے پسند نہیں کرتے۔ ہوسکتا ہے کہ پہلے انتخاب میں ہم عوام کے طرزِفکر اور معیارِ انتخابات کو بدلنے میں پوری طرح کامیاب نہ ہوسکیں۔ لیکن اگر انتخابی نظام درست رکھا جائے تو ایک وقت ایسا آئے گا جب نظامِ حکومت پورے کا پورا ایمان دار لوگوں کے ہاتھ میں آجائے گا۔ اس کے بعد پھر ہم نظامِ انتخاب پر نظرثانی کرسکتے ہیں اور اس مثالی نظامِ انتخابات کو ازسرِنو قائم کرنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں جو اسلامی طریقے کے عین مطابق ہو۔ بہرحال آپ یک لخت جست لگا کر اپنی انتہائی منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔ (نبی اکرمؐ کا نظامِ حکومت اور پاکستان میں اس کا نفاذ، ص ۱۹-۲۷)

بیاضِ حکمت

مغرب کے ستم کار

ظلم وفساد کے امام

یورپ کے مدبرینِ سیاست کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ اندر ہی اندر فتنہ انگیزیاں کرتے رہتے ہیں اور دوسری طرف جب ان کی شرارتوں کا میگزین پھٹنے پر آتا ہے تو ان میں سے ہر ایک اصلاح اور امن پسندی کا مدعی، حق وانصاف کا حامی اور ظلم وزیادتی کا دشمن بن کر اٹھتا ہے اور دنیا کو یقین دلانا چاہتا ہے کہ میں تو صرف خیر وصلاح چاہتا ہوں، مگر میرا مدمقابل ظلم و بے انصافی پر تلا ہوا ہے، لہٰذا آؤ اور میری مدد کرو۔ حقیقت میں تو سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ سب ظلم وفساد کے امام ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا دامن مظلوموں کے خون سے سرخ ہے۔ ہر ایک کا نامۂ اعمال ان سب گناہوں سے سیاہ ہے جن کا الزام یہ ایک دوسرے پر لگاتے ہیں۔ لیکن یہ ان کی پرانی عادت ہے کہ جب یہ اپنی مفسدانہ اغراض کے لئے لڑتے ہیں تو اخلاق اور انسانیت اور جمہوریت اور کمزور قوموں کے حقوق کی حمایت کا سراسر جھوٹا دعویٰ لے کر دنیا کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ وہ بہت سے بے وقوف انسان جو ان کے قبضہ قدرت میں ہیں، ان کی لڑائی کو حق اور انصاف کی لڑائی سمجھ کر ان کی ناپاک خواہشات کے حصول میں مددگار بن جائیں، اور وہ بہت سے خوشامدی لوگ جو اپنی ذلیل اغراض کے لئے ان کا ساتھ دینے پر آمادہ ہیں، اپنے آپ کو ایک مقصدِ حق کا حمایتی بنا کر پیش کریں اور سرخ رو بن جائیں۔

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

بارش اور پانی، اللہ کی نشانی

پروفیسر شہزادالحسن چشتی

اللہ تعالیٰ کی آیات میں سے ایک بارش بھی ہے۔ آیت کے اصل معنی اس نشانی یا علامت کے ہیں جو کسی چیز کی طرف رہنمائی کرے۔ قرآن میں یہ لفظ چار مختلف معنوں میں آیا ہے۔ کہیں اس سے مراد محض علامت یا نشانی ہی ہے۔ کہیں آثارِ کائنات کو اللہ کی آیات کہا گیا ہے، کیونکہ مظاہر قدرت میں سے ہر چیز اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو اس ظاہری پردے کے پیچھے مستور ہے۔ کہیں معجزاتِ رسولؐ کو آیت کہا گیا ہے اور کہیں کتاب اللہ کے فقروں کو آیت کہا گیا ہے۔ بارش چونکہ مظاہر قدرت میں سے ہے، لہٰذا یہ بھی اللہ کی آیت یا نشانی ہوئی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ، بہت سی آیات میں عالمِ بالا سے کرۂ ارض پر بارش برسانے کا ذکر فرماتا ہے اور غور وفکر کی دعوت دیتا ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً (الزمر ۳۹:۲۱) ''کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا''۔ کہیں بادلوں سے پانی کے برسنے کا بیان ہے: اَفَرَاَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِىْ تَشْرَبُوْنَ ۝ ءَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ۝ (الواقعہ ۵۶:۶۸-۶۹) ''یہ پانی جو تم پیتے ہو اسے تم نے بادل سے برسایا ہے یا اس کے برسانے والے ہم ہیں؟'' وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۝ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۝ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ۝ (النبا ۷۸:۱۴-۱۶) ''اور بادلوں سے لگاتار بارش برسائی تاکہ اس کے ذریعے سے غلّہ اور سبزی اور گھنے باغ اُگائیں''۔ بعض آیات میں آسمان سے رزق نازل کرنے کا بیان ہے: وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ (الجاثیہ ۴۵:۵) ''اور اُس رزق میں جسے اللہ آسمان سے نازل فرماتا ہے، پھر اس کے ذریعے سے مُردہ زمین کو جلا اُٹھاتا ہے''۔

کرۂ ارض پر موجود پانی کو اللہ تعالیٰ بخارات میں تبدیل فرماتا ہے، جو بادلوں کی صورت ہوا کے دوش پر آسمان (عالمِ بالا) کی طرف سفر کرتے ہیں اور جہاں جہاں ان کی ضرورت ہوتی ہے پھیلا دیے جاتے ہیں اور زمین کے اُوپر ایک خاص فاصلے پر پہنچ کر بالعموم پانی کی بوندوں کی شکل میں زمین ہی پر برس پڑتے ہیں۔ بعض اوقات اولوں اور برف کے گالوں کی صورت میں بھی ہوتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ بڑے خوش کن اور خوب صورت پیرایے میں بادلوں کے بننے اور ان سے پانی کے برسنے کو بیان فرماتا ہے:

- قسم ہے اُن ہواؤں کی جو گرد اڑانے والی ہیں، پھر پانی سے لدے ہوئے بادل اُٹھانے والی ہیں، پھر سبک رفتاری سے چلنے والی ہیں، پھر ایک بڑے کام (بارش) کی تقسیم کرنے والی ہیں۔ (الذاریات ۵۱:۱-۴)
- قسم ہے اُن (ہواؤں) کی جو پے در پے بھیجی جاتی ہیں، پھر طوفانی رفتار سے چلتی ہیں اور بادلوں کو اُٹھا کر پھیلاتی ہیں، پھر (ان کو) پھاڑ کر جدا کرتی ہیں۔ (مرسلٰت ۷۷:۱-۴)
- اور وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے خوش خبری لیے ہوئے بھیجتا ہے، پھر جب وہ پانی سے لدے ہوئے بادل اُٹھا لیتی ہیں تو انھیں کسی مُردہ سرزمین کی طرف حرکت دیتا ہے اور وہاں مینہ (پانی) برسا کر (اسی مری ہوئی زمین سے) طرح طرح کے پھل نکال لاتا ہے۔ (الاعراف ۷:۵۷)
- بارآور ہواؤں کو ہم ہی بھیجتے ہیں، پھر آسمان سے پانی برساتے ہیں اور اس پانی سے تمھیں سیراب کرتے ہیں۔ اس دولت کے خزانہ دار تم نہیں ہو۔ (الحجر ۱۵:۲۲)
- وہی ہے جو تمھارے سامنے بجلیاں چمکاتا ہے جنھیں دیکھ کر تمھیں اندیشے بھی لاحق ہوتے ہیں اور اُمیدیں بھی بندھتی ہیں۔ وہی ہے جو پانی سے لدے ہوئے بادل اُٹھاتا ہے۔ بادلوں کی گرج اُس کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتی ہے اور فرشتے اس کی ہیبت سے لرزتے ہوئے اس کی تسبیح کرتے ہیں۔ وہ کڑکتی ہوئی بجلیوں کو بھیجتا ہے اور (بسا اوقات) انھیں جس پر چاہتا ہے عین اس حالت میں گرا دیتا ہے، جب کہ لوگ

اللہ کے بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں۔ فی الواقع اُس کی چال بڑی زبردست ہے۔(الرعد ۱۳:۱۲-۱۳)

بارش کی سائنسی توجیہ

کرۂ ارض پر موجود پانی سمندر، دریا، جھیلوں کی کھلی سطح، زمین کے مسام، دودھ پلانے والے حیوانات (میملز) کی جلد پر موجود مسام اور درختوں اور پودوں کے پتوں پر ننھے ننھے سوراخوں سے بخارات میں تبدیل ہوتا ہے۔ اس کی وجہ کھلا ماحول، اس میں ہوا کی گردش اور ماحول کا درجۂ حرارت ہے اور یہ سورج کی تپش کا نتیجہ ہے۔ حکمت الٰہیہ کے تحت بخارات ہوا کے دوش پر عالمِ بالا کی طرف حرکت کرتے ہیں۔ دراصل یہی بخارات بادل ہیں اور ان کی مقدار بادلوں کو گہرا یا ہلکا بناتی ہے۔ سمندر کی سطح سے ان بخارات کے ساتھ نمک کے نہایت مہین ذرات بھی بادلوں میں شامل ہوتے ہیں۔ یہ بادل جلد ہی ننھی آبی بوندوں میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ بخارات کا پانی کسی بھی ننھے سے نمک کے ذرّے کے گرد جمع ہوجاتا ہے یا پھر کائناتی دھول کے ننھے سے ذرے کے گرد جمع ہوتا ہے۔ یہ کائناتی دھول کیا ہے اور اس کے ذرات کیا ہیں؟ یہ بات ابھی تک پردۂ اخفا میں ہے۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک کیوبک سنٹی میٹر رقبے میں ۵۰-۵۰۰ ننھی آبی بوندیں ہوتی ہیں۔ پھر یہ بوندیں بارش کی شکل میں برسنے والی بوندوں میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔ یہ کس طرح ہوتا ہے؟ یہ بھی ابھی تحقیق طلب ہے۔ دو سائنس دانوں برگیرون اور فنڈیسن (Bergeron اور Findeisen) نے ۱۹۵۰ء میں مذکورہ نظریہ پیش کیا تھا۔ جب بارش برستی ہے تو یہ ننھی آبی بوندیں، یعنی ایک مرکز کے گرد جمع شدہ پانی، عالمِ بالا سے زمین کی طرف جیسے جیسے گرتی ہیں تو ہر بوند پھیلتی ہے اور اس کی سطح کا رقبہ بڑھ جاتا ہے۔ اس کے باعث آبی بوند کے گرنے کی رفتار ہوا کی رکاوٹ کے باعث کم ہوجاتی ہے اور بوند نہایت آہستگی سے زمین پر اس طرح گرتی ہے جیسے کسی پیراشوٹ کے ذریعے اُتری ہو، ورنہ بغیر رکاوٹ کے عالمِ بالا سے برسنے والی بوندیں زمینی مخلوق کا زندہ رہنا مشکل بنادیں۔ یہ سب اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہے۔

بارش کے برسنے کے موضوع پر مزید انسانی تحقیقات کے نتیجے میں اور بھی توجیہات سامنے آئیں گی، مگر بنیادی حقیقت وہی ہے جسے قرآنِ حکیم میں بیان کیا گیا ہے: ''کیا تم دیکھتے نہیں

ہو کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا‘‘ (الزمر ۳۹:۲۱)۔ گویا اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ کائنات تخلیق کی ہے، وہی اس کا مالک وآقا ہے اور اُس نے کرۂ ارض پر بارش برسانے کا نظام قائم کیا ہے۔ اس کے قوانین بنائے ہیں اور اس کے ذریعے زمین پر اپنی مخلوقات کے لیے رزق کے بہم پہنچانے کا انتظام کیا ہے۔ انسان کا کام یہ ہے کہ وہ ان قوانین اور اس نظام کے معلوم کرنے کے لیے جدوجہد کرے اور صرف اور صرف اللہ کی کبریائی بیان کرے اور فرشتوں کی طرح اس کی تسبیح بیان کرے اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائے۔ کسی فرشتے یا جنّ یا انسان یا مٹی اور پتھر کے بنے بتوں میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ یہ کام کرسکیں۔ لہٰذا بارش برسنے کا عمل انسان سے خداے واحد پر ایمان کا متقاضی ہے۔

بارش کا برسنا اور کرۂ ارض پر اس کے اثرات

اس حوالے سے زمین پر بارش کے اثرات کے سلسلے میں پانی، ہوا، ماحول کی تپش، مٹی اور اس میں موجود زندہ اور مُردہ اجزا وغیرہ اہم ہیں۔

● **پانی، قدرت کا کرشمہ:** کائنات کی تخلیق کے ساتھ ہی اللہ تبارک وتعالیٰ نے کرۂ ارض پر وافر مقدار میں پانی پیدا فرمایا۔ کائنات کے دوسرے کرّوں پر پانی موجود ہے یا نہیں، اس پر تحقیق جاری ہے۔ پانی ہائیڈروجن اور آکسیجن گیسوں کا مجموعہ ہے۔ ہائیڈروجن کے دو مالیکیول اور آکسیجن کا ایک مالیکیول باہم مل کر پانی بناتے ہیں۔ اگر پانی میں برقی رَوگزاری جائے تو وہ آکسیجن اور ہائیڈروجن میں تقسیم ہو جائے گا۔ آکسیجن آگ بھڑکانے والی گیس ہے، جب کہ ہائیڈروجن بھڑک اُٹھنے والی ہے مگر خدا کی قدرت کہ جب یہ دونوں گیسیں باہم مل کر پانی بن جائیں تو یہی آگ بجھانے والا پانی بن جاتا ہے۔

پانی ایک بے رنگ، بے ذائقہ مگر فرحت بخش، بے بو، شفاف اور پتلا مائع ہے۔ اس کی اپنی کوئی شکل نہیں۔ جس برتن میں ڈالیں اِس کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اُوپر سے نیچے کی طرف بڑی تیز رفتاری سے بہتا ہے اور بہنے کے دوران توانائی پیدا کرلیتا ہے۔ پانی کی اس توانائی کو انسان نے آبی بجلی پیدا کرنے کا ذریعہ بنالیا ہے اور اسی مقصد کے لیے بڑے چھوٹے آبی ذخائر بنائے جاتے ہیں۔ سورج کی شعاع جب پانی کی بوند سے گزرتی ہے تو سات رنگوں میں منتشر ہوکر قوسِ قزح بناتی ہے جس کو بالعموم بارش کے بعد آسمان کے ایک جانب سات خوب صورت رنگوں کے قوس

میں دیکھا جاسکتا ہے۔

کرۂ ارض کا ۴/۳ حصّہ پانی ہے۔ اصل ذخیرہ تو سمندروں میں ہے جہاں کُل پانی کا ۹۷فی صد ہوتا ہے، یعنی کل ۳ فی صد میٹھا پانی ہے جو دریا، جھیل، تالاب اور کنوؤں میں ہوتا ہے۔ زمین کی اُوپر کی سطح کے نیچے جذب شدہ پانی کا ذخیرہ ہوتا ہے اور پودوں اور حیوانات کے جسموں میں بھی ایک خاص مقدار ہوتی ہے۔ سارے ہی زندہ حیات کے جسموں میں پانی ایک انتہائی اہم جز ہے۔ انسان کے جسم میں ہر وقت ۴۰ تا ۵۰ لٹر پانی موجود ہوتا ہے، یعنی انسان کی جسامت کا ۶۰ تا ۷۰ فی صد۔ پانی کی اہمیّت اس وقت زیادہ محسوس ہوتی ہے جب پیاس لگتی ہے۔ انسان اور دوسرے جان داروں میں ایک خاص مقدار سے کم پانی موت کا پیغام ہے۔ پانی کا یہ توازن جسم کو زندہ اور متحرک رکھنے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ پانی کی قدرتی خصوصیات یوں تو بے جان اور جان دار دونوں کے لیے انتہائی اہم ہیں، مگر جان داروں کے لیے تو پانی آبِ حیات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات میں مختلف قسم کے مائعات پیدا فرمائے ہیں مگر طبیعی اور کیمیاوی خصوصیات کے باعث صرف پانی ہی کو زندگی کے لیے لازمۂ حیات بنایا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے پانی میں ایک انتہائی اہم خصوصیّت پیدا فرمائی ہے، جو اللہ کے رحمٰن ہونے کی نشان دہی کرتی ہے۔ پانی منفی چار (۴-) سینٹی گریڈ تک تو دوسرے مائعات کی طرح تبدیل ہوتا ہے مگر اس سے کم درجۂ حرارت پر یہ کثیف ہونے کے بجائے لطیف ہوجاتا ہے اور پھیلتا ہے۔ پھر جب پانی برف میں تبدیل ہوتا ہے تو یہ برف، مائع پانی سے وزن میں ہلکی ہوتی ہے، لہٰذا برف پانی کی سطح پر تیرتی رہتی ہے، اس کی تہہ میں نہیں بیٹھتی۔ پانی کی یہ خصوصیّت اس حقیقت کی غماز ہے کہ سردیوں میں دریاؤں، سمندروں اور جھیلوں کا پانی اوّلاً تو منفی چار سینٹی گریڈ تک سرد ہوجاتا ہے مگر مزید سردی میں اپنی زیریں سطح پر ٹھنڈا ہوکر برف کی صورت سخت اور وزن میں ہلکا ہوجاتا ہے اور پانی کی سطح پر تیرتا رہتا ہے۔ برف کے نیچے اس پانی میں آبی حیات (پودے اور حیوانات) زندہ رہتے ہیں اور معمول کی زندگی گزارتے ہیں۔

یہ بھی اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ پانی دوسرے مائعات کی طرح اپنی زیریں سطح، یعنی تلی یا تہہ کی جانب سے سرد ہونا شروع نہیں کرتا، بلکہ صفر سینٹی گریڈ کے درجۂ حرارت پر اپنی بالائی سطح پر

سرد ہونا اور برف میں تبدیل ہونا شروع ہوتا ہے اور برف بننے کے ساتھ ساتھ پھیلتا اور ہلکا ہو جاتا ہے، لہٰذا یہ برف سطح آب پر تیرتی رہتی ہے، تہہ میں نہیں بیٹھتی ہے۔ بس سطح آب سے ایک میٹر نیچے تک اس کی دبیز چادر قائم ہو جاتی ہے، اس میں رخنے اور دراڑیں پیدا ہو جاتی ہیں جن کے ذریعے آبی جانور، مثلاً سیل یا پینگوئن وغیرہ سردی سے بچنے کے لیے پانی کے اندر اُتر جاتے ہیں۔ اس لیے کہ برف کی دبیز تہہ اندر کے پانی کی حرارت کو جلد باہر کی طرف خارج نہیں ہونے دیتی اور برف کی تہہ سے حرارت کا گزر بہت سُست رفتار ہوتا ہے۔ پانی کی یہ منفرد خصوصیت اور اس کے اندر آبی حیات کا سرد علاقوں اور سرد حالات میں زندگی بسر کرنا ایک ایسا لطیف توازن ہے جس کا قوانینِ فطرت کے تحت خود بخود قائم ہو جانا ناممکن ہے۔

● **پانی سے زندگی کی پیدایش:** یہ ایک مفروضہ ہے کہ زمانۂ قدیم میں اوّلین یا ابتدائی زندگی پانی کے اجزا اور اس میں شامل مختلف نمکیات اور دھاتوں کے کیمیاوی تعامل سے سمندر میں کہیں پیدا ہوئی۔ پھر نسلی تسلسل کے نتیجے میں اس ابتدائی زندگی سے انواع واقسام کے پودے اور حیوانات پیدا ہوتے اور پھیلتے چلے گئے۔ یہ ظنی اور تخمینی مفروضہ شواہد اور تجربات کا محتاج ہے۔ گذشتہ صدیوں میں اس مفروضے کو ثابت کرنے کی بڑی کوششیں کی گئیں مگر اب تک کی کوششیں سب ناکام ہیں۔ یہ مفروضہ کیونکہ نظریۂ نامیاتی ارتقا کی بنیاد ہے، اس لیے اس کی ناکامی نظریۂ ارتقا کی ناکامی بھی ہے۔

● **پانی ہی میں زندگی کی نشوونما:** یہ ایک حقیقت ہے کہ زندگی پانی کے بغیر پرورش نہیں پاسکتی۔ کسی بھی پودے کے بیج کے اندر موجود جنین میں اللہ نے پانی کی ایک مخصوص مقدار پیدا فرمائی ہے، جو جنین کو نہ صرف بڑے عرصے تک زندہ رکھتی ہے بلکہ آہستہ آہستہ نشوونما بھی دیتی ہے۔ جب یہ بیج زمین میں بویا جاتا ہے اور پانی سے سینچا جاتا ہے تو بیج نشوونما پا کر جلد ہی پودے کی شکل میں پھوٹ نکلتا ہے۔ اگر بیج میں پانی مفقود ہو جائے تو اس کے اندر کا جنین مُردہ ہو جائے گا اور کسی صورت بھی نشوونما نہ پاسکے گا۔

جانوروں کے انڈے اور چھلکے یا جھلّی کے اندر بھی جنین کے گرد پانی کی ایک مخصوص مقدار پیدا کی گئی ہے۔ اس پانی میں جنین پرورش پاتا ہے اور مخصوص وقت پر جھلّی اور چھلکا توڑ کر باہر نکل

آ تا ہے۔ یہاں بھی پانی کی غیرموجودگی جنین کے نشوونما پر منفی اثرات ڈالتی ہے۔ دودھ پلانے والے حیوانات کے (مثلاً گائے، بھینس، بکری وغیرہ اور انسان بھی ان میں شامل ہے) رحم میں پرورش پاتے ہوئے جنین کے گرد تین پردے ہوتے ہیں جن میں پانی بھرا ہوتا ہے اور جنین درحقیقت اس پانی میں تیرتا رہتا ہے۔ اسی کے ذریعے اپنی غذا بھی حاصل کرتا ہے اور جسم میں پیدا ہونے والے گندے مادے بھی خارج کرتا ہے اور پیدایش کے وقت اس پانی کی قوت سے اپنے مقررہ وقت پر رحمِ مادر سے خارج کردیا جاتا ہے۔ پرورش پانے والے جنین کے گرد پانی کی کمی یا زیادتی اس کی نشوونما کو متاثر کرتی ہے۔ لہٰذا یہاں بھی پانی کا موجود ہونا اور متوازن ہونا لازمی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ط اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ o (الانبیاء ۲۱:۳۰)، ''اور ہر زندہ چیز کو ہم نے پانی سے پیدا کیا، پھر یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے''۔

● **پانی اور انسانی جسم**: پانی میں ایک خصوصیت یہ بھی اللہ نے پیدا کی ہے کہ ٹھنڈا ہونے کی صورت میں اس کے اندر موجود حرارت خارج ہوجاتی ہے۔ اسی طرح جب پانی کے بخارات ٹھنڈے ہوتے ہیں تو ان کے اندر سے بھی حرارت خارج ہوتی ہے۔ یہ پانی کی مخفی حرارت کہلاتی ہے۔ پانی جلد گرم نہیں ہوتا، یعنی پانی کو گرم کرنے کے لیے زیادہ حرارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے پانی کی حرّی صلاحیت کہتے ہیں۔ پانی میں سے حرارت تیزی سے گزر جاتی ہے۔ اس کو پانی کی حرارت پذیری کہا جاتا ہے، اور خاص درجۂ حرارت، یعنی ۱۰۰ درجہ سینٹی گریڈ پر پانی بخارات میں تبدیل ہوکر اتنا ہلکا ہوجاتا ہے کہ ہوا اسے اپنے دوش پر عالمِ بالا کی طرف بادلوں کی شکل میں لے جاتی ہے۔

غور کریں کہ پانی کی یہ خصوصیات انسانی جسم کو کس طرح چاق چوبند رکھتی ہیں۔ انسانی جسم کا درجۂ حرارت بالعموم ۲۵ تا ۴۰ درجہ سینٹی گریڈ کے درمیان رہتا ہے۔ اگر یہ درجۂ حرارت کسی ایک ہی درجے پر قائم ہوجائے اور طویل عرصے تک قائم رہے تو موت کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ اگر ایک طویل عرصے تک جسم کا درجۂ حرارت ۴۰ درجہ سینٹی گریڈ پر قائم رہے تو انسان کے جسم کے اندر موجود پانی جو جسم کے افعال میں توازن قائم رکھتا ہے جس سے انسان چاق چوبند رہتا ہے، اس میں انتشار پیدا ہوجائے گا اور یہ توازن درہم برہم ہوجائے گا۔

● **پانی کی شفافیت:** قدرتی پانی نہایت شفاف ہوتا ہے، یعنی اس میں کیمیاوی اجزا کی آمیزش نہیں ہوتی۔ اسے آپ مقطر بھی کہہ سکتے ہیں۔ بالعموم بارش کا پانی آبِ مقطر ہوتا ہے۔ پانی کی شفافیت اور سورج کی روشنی کا اس میں سے گزرنے کا بھی ایک تعلّق ہے۔ نظر آنے والی روشنی شفاف پانی سے گزر جاتی ہے۔ روشنی کی انفراریڈ شعاع جو تپش بھی پیدا کرتی ہے وہ بھی چند ملی میٹر گہرائی تک پانی میں اُتر جاتی ہے۔ اسی لیے سمندر اور دریاؤں کا پانی اتنی ہی گہرائی تک سورج کی روشنی سے متاثر ہوتا ہے، جب کہ اس سے زیادہ گہرائی میں پانی دُور دُور تک ایک ہی درجۂ حرارت پر رہتا ہے۔ سورج کی روشنی کی مختلف رنگت کی شعاعیں بھی صرف ۱۰۰ میٹر کی گہرائی تک پانی میں اُترتی ہیں مگر ارزق (نیلی) اور سبز رنگت کی شعاعیں تقریباً ۲۴۰ میٹر تک گہرائی میں پہنچتی ہیں۔ اس کی وجہ سے دریا اور سمندروں کی اس گہرائی میں آبی پودے اُگتے ہیں جن کو ضیائی تالیف (فوٹوسنتھسز) کے لیے روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سب قدرتِ حق کے خدائی توازن کا حصّہ ہے۔

● **اللہ نے ٹھیک حساب کے مطابق پانی اُتارا:** ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِی الْاَرْضِ وَاِنَّا عَلٰی ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ (المومنون ۲۳:۱۸)، اور آسمان سے ہم نے ٹھیک حساب کے مطابق ایک خاص مقدار میں پانی اُتارا اور اس کو زمین میں ٹھیرا دیا۔

وَالَّذِیْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ (الزخرف ۴۳:۱۱)، جس نے (اللہ نے) ایک خاص مقدار میں آسمان سے پانی اُتارا۔ اور اس کے ذریعے سے مُردہ زمین کو جلا اُٹھایا۔

آسمان اور زمین، یعنی کائنات کی تخلیق کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے بیک وقت پانی کی اتنی مقدار نازل فرمائی جو قیامت تک کرۂ زمین کی ضروریات کے لیے اُس کے علم میں کافی تھی۔ وہ پانی زمین کے نشیبی حصوں میں ٹھیر گیا، جس سے سمندر اور بحرے وجود میں آئے اور زیرِ زمین پانی پیدا ہوا۔ اب اسی پانی کا اُلٹ پھیر (دوران) ہے جو گرمی سردی اور ہواؤں کے ذریعے ہوتا رہتا ہے۔ اسی سے بارشیں وجود پاتی اور زمین کے مختلف حصوں میں پانی پھیلایا جاتا رہتا ہے۔ یہی پانی بے شمار چیزوں کی پیدایش اور ترکیب میں استعمال ہوتا رہتا ہے۔ ابتدا سے آج تک پانی کے اس ذخیرے

میں نہ تو ایک قطرے کی کمی ہوتی ہے اور نہ ایک قطرہ اضافے کی ضرورت ہی پیش آتی ہے۔ ہزاروں سال سے اللہ کا قائم کیا ہوا پانی کا یہ مقداری توازن قائم ہے۔ انسان تو اس توازن میں بگاڑ پیدا کرنے پر بھی قادر نہیں۔ یہاں یہ حقیقت واضح رہے کہ پانی ہی نہیں بلکہ کائنات کی ہر چیز، مثلاً ہوا، روشنی، گرمی، سردی، جمادات، نباتات، حیوانات، غرض ہر چیز، ہر نوع، ہر جنس اور قوت و طاقت، توانائی کے لیے ایک حد مقرر ہے جس پر وہ ٹھیری ہوئی ہے اور ایک مقدار مقرر ہے جس سے نہ وہ گھٹتی ہے اور نہ بڑھتی ہے۔

● **اگر پانی زمین میں اُتر جائے**: یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ وہ اللہ جس نے آسمان سے زمین پر پانی برسایا، اگر اس پانی کو زمین کے اندر گہرائی میں اُتار لے جائے تو بارش کہاں سے برسے گی اور زمینی مخلوق کے لیے پانی کہاں سے حاصل ہوگا؟ گویا اس بات کا امکان ہے۔ اللہ نے اس کی تنبیہہ ضرور کی ہے مگر وہ بڑا ارحم الراحمین ہے!

قُلْ اَرَءَ يْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ○ (الملک ۶۷:۳۰) ان سے کہو، کبھی تم نے یہ بھی سوچا تمھارے کنوؤں کا پانی زمین میں اُتر جائے تو کون ہے جو پانی کی بہتی ہوئی سوتیں تمھیں نکال کر لا دے گا۔

● **اگر پانی کھارا بنا دیا جائے**: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ○ ءَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ○ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ○ (الواقعہ ۵۶: ۶۸-۷۰) ''کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا، یہ پانی جو تم پیتے ہو، اسے تم نے بادل سے برسایا ہے، یا اس کے برسانے والے ہم ہیں؟ ہم چاہیں تو اسے سخت کھاری بنا کر رکھ دیں، پھر کیوں تم شکرگزار نہیں ہوتے؟

وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ○ (المرسلات ۷۷:۲۷) اور تمھیں میٹھا پانی پلایا۔

بارش سے برسایا جانے والا پانی میٹھا اور پینے کے قابل ہوتا ہے۔ اگر اللہ بارش کا یہ نظام قائم نہ کرتا تو کرۂ ارض کے باسیوں کے لیے میٹھے پانی کا حصول ناممکن تھا، لہٰذا کرۂ ارض پر زندگی کا وجود ناممکن ہوتا۔ یہ صرف اللہ کی رحمت ہی ہے کہ اس نے بارش کو میٹھے پانی کے حصول کا ذریعہ بنایا

ہے اور کرۂ ارض کی ساری مخلوق اس سے مستفید ہو رہی ہے۔

پانی___ ایک وسیع عنوان ہے جو ایک علیحدہ اور جامع مضمون کا متقاضی ہے۔

● **ماحول کی تپش**: کرۂ ارض کی وہ تپش جو پانی کو بخارات میں تبدیل کرتی ہے، سورج کی روشنی میں موجود حرارت سے حاصل ہوتی ہے۔ نظامِ شمسی میں کرۂ ارض سے سورج کا فاصلہ ۹۳ ملین میل ہے۔ اس کا قطر زمین سے ۱۰۳ گنا بڑا ہے۔ زمین کی اپنے محور پر گردش کے باعث اس کا وہ حصہ جو سورج کے سامنے آتا جاتا ہے روشن ہو جاتا ہے اور یہاں تقریباً ۱۲ گھنٹے کا دن ہوتا ہے، جب کہ زمین کا وہ حصہ جو سورج کے سامنے نہیں ہوتا، وہاں رات ہوتی ہے۔ زمین سورج کی کرنوں سے وافر مقدار میں تپش حاصل کر لیتی ہے جس سے اس کے ماحول میں ہر وقت تپش رہتی ہے اور اس تپش کی حد ۲۰- تا ۱۲۰+ سینٹی گریڈ کی حد میں رہتی ہے۔ یہی تپش ہے جو زمین پر موجود پانی خصوصاً سمندروں کے پانی کو بخارات میں تبدیل کرتی ہے جو بادلوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

سائنس دانوں کی یہ دل چسپ تحقیق ہے کہ کرۂ ارض کا سورج سے فاصلہ اور زمین کے محور کا سورج کے مدار کی سمت ۲۳ درجے کا جھکاؤ___ یہ دو وجوہ ہیں جن کے باعث کرۂ ارض کا درجہ حرارت ۲۰- تا ۱۲۰+ ڈگری کے درمیان رہتا ہے۔ یہی وہ درجۂ حرارت ہے جس میں جان دار اپنا وجود قائم رکھتی ہے ورنہ زمین پر بھی دوسرے سیاروں کی طرح جان دار کا وجود ناممکن ہوتا۔ تپش کا یہی وہ توازن ہے جو اللہ نے زمین پر قائم رکھا ہوا ہے۔ زمین پر پہاڑ میخوں کے ذریعے مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں اور ایستادہ ہیں، کسی طرف لڑھک نہیں جاتے۔ اس صورت میں یہ زمین کا توازن بھی قائم رکھتے ہیں تاکہ زمین کسی ایک طرف ڈھلک نہ جائے۔ پہاڑوں کے دامن میں قدرے گرم ماحول اور بلندی پر ٹھنڈا ماحول بھی توازن قائم رکھنے میں مددگار ہے۔

سورج کی حرارت جہاں پانی کو بخارات میں تبدیل کرتی ہے وہیں ایک اور اہم کام بھی کرتی ہے۔ زمین پر موجود پودوں کے سبز پتوں میں موجود خلیوں میں موجود سبز ینہ (کلوروفل) نامی کیمیاوی مادہ موجود ہوتا ہے۔ سورج کی روشنی اس میں جذب ہو جاتی ہے اور اس میں موجود پانی میں، جو پودے کی جڑوں کے ذریعے جذب ہو کر تنے اور شاخوں اور پتوں کی نالیوں کے ذریعے آتا ہے، اس سے اور پتوں میں موجود آکسیجن گیس کے تعامل کے ذریعے گلوکوز نامی غذا بناتی ہے۔

گلوکوز دراصل بنیادی غذا ہے جو بعد میں نشاستے میں تبدیل ہوکر پودے کے مختلف حصوں میں جمع ہوجاتا ہے۔

● **ہوا اور بارش**: کرۂ ارض کے ماحول میں ہوا انتہائی اہم ہے۔ ہوا میں ۲۱ فی صد آکسیجن، ایک فی صد کاربن ڈائی آکسائیڈ، ۷۷ فی صد نائٹروجن ہے۔ زندہ اجسام کے لیے یہ سب گیسیں کسی نہ کسی صورت میں اہم ہیں اور کرۂ ارض کے ماحول میں پھیلتی رہتی ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی قدرتی گیسیں ہیں مگر ایک تو ان کی مقدار ماحول میں انتہائی قلیل ہے اور دوسرے یہ زندہ اجسام کے لیے یہ زیادہ اہم نہیں۔ یہ گیسیں ہوا کی صورت ہلکی اور تیز رفتاری سے ماحول میں حرکت کرتی رہتی ہیں اور جو بھی ان کے راستے میں آتا ہے ان پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

ہوائیں پانی کے بخارات کو جو اَب بادلوں کی صورت ہوتے ہیں، اُٹھا کر عالمِ بالا کی طرف لے جاتی ہیں۔ پھر روے زمین میں پھیلا کر اللہ کے حکم کے مطابق جہاں جتنی ضرورت ہوتی ہے پانی تقسیم کرتی (برساتی) ہیں۔ پانی کی تقسیم میں بھی توازن ہے۔ کسی بھی علاقے کی سالانہ بارش کے ریکارڈ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں بارش کا سالانہ ایوریج تقریباً یکساں رہتا ہے، یا کچھ کم یا زیادہ۔ بعض علاقوں میں بڑے عرصے تک بارش نہیں ہوتی اور خشک سالی کا شکار ہوجاتے ہیں مگر پھر جب بارش ہوتی ہے تو جل تھل ہوجاتا ہے، یعنی خشک سالی کے دوران میں بارش کی کمی کا حساب برابر کردیا جاتا ہے۔ (دیکھیے: الذاریات ۵۱:۱-۲، اور الزخرف ۴۳:۱۱)

ہواؤں کے زیراثر آسمان پر اکثر طرح طرح کی شکلوں والے بادل چھا جاتے ہیں جن میں بار بار تغیّر ہوتا رہتا ہے اور کبھی کوئی ایک شکل نہ خود قائم رہتی ہے اور نہ کسی اور شکل ہی سے مشابہ ہوتی ہے۔ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ (الذاریات ۵۱: ۵) ''قسم ہے مختلف شکلوں والے آسمان کی''۔ یہ بادل سیاہ بھی ہوتے ہیں اور سفیدی مائل بھی۔ سیاہ بادلوں میں آبی بوندوں کے باعث منفی اور مثبت برقی بار پیدا ہوجاتا ہے اور جب یہ دونوں برقی بار آپس میں ملتے ہیں تو بادلوں میں شدید گڑگڑاہٹ پیدا ہوتی ہے اور آسمانی بجلی کی تیز روشنی اور کڑک و چمک بھی پیدا ہوتی ہے۔ اللہ اس بجلی کو بسااوقات جس پر چاہتا ہے گرادیتا ہے، جب کہ وہ اللہ کے بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں، یعنی ایسے کاموں میں مصروفِ عمل ہوتے ہیں جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔ ایک طرح سے یہ اللہ کا

ایسے لوگوں پر تازیانہ ہے (دیکھیے: الرعد ۱۳: ۱۲-۱۳)۔ یہی بجلی ہے جسے انسان نے اپنی کاوشوں سے زمین پر اُتارا ہے اور اپنے اردگرد کے تاریک ماحول کو اُجالوں میں تبدیل کرلیا ہے۔ اللہ جب کسی مقام پر آسمانی بجلی گراتا ہے تو یہ اس مقام کی ہر چیز کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔

ہواؤں کے دوش پر پانی لیے ہوئے بادل 'خوش خبری' لیے ہوئے بھی ہوتے ہیں۔ انسان خوش ہوتا ہے کہ اب بارش ہوگی، گرمی اور حبس ختم ہوگا، زمین نرم ہوگی اور سونا اُگلے گی۔ کھیت لہلہائیں گے، فصلیں پیدا ہوں گی، غلّہ اُگے گا، باغوں میں رنگ برنگے خوش نما پھول اور مختلف اقسام کے پھل پیدا ہوں گے اور اس طرح انسان اور جانوروں کے لیے رزق کا انتظام ہوگا۔ یہ سب اللہ کی رحمت ہے جو اپنی رحمت کے آگے ہواؤں کو بشارت بنا کر بھیجتا ہے۔ (دیکھیے الفرقان ۲۵: ۴۸-۵۰)

یہی ہوائیں اور بارش کبھی خدا کے عذاب کی شکل بھی اختیار کرلیتی ہے۔ یہی بارش ہے جسے اللہ نے طوفانِ نوحؑ میں تبدیل کر دیا اور حضرت نوحؑ کی قوم چند نفوس کے علاوہ بارش کے اس طوفان میں غرق کر دی گئی:

فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ○ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ○ وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ○ تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا ۚ جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ○ وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ○ (القمر ۵۴: ۱۱-۱۵) تب ہم نے موسلا دھار بارش سے آسمان کے دروازے کھول دیے اور زمین کو پھاڑ کر چشموں میں تبدیل کر دیا، اور یہ سارا پانی اس کام کو پورا کرنے کے لیے مل گیا جو مقدر ہو چکا تھا، اور نوحؑ کو ہم نے ایک تختوں اور کیلوں والی پر سوار کر دیا جو ہماری نگرانی میں چل رہی تھی۔ یہ تھا بدلہ اس شخص کی خاطر جس کی ناقدری کی گئی تھی۔ اس کشتی کو ہم نے نشانی بنا کر چھوڑ دیا۔ پھر کوئی ہے نصیحت قبول کرنے والا؟

قومِ لوطؑ پر پتھر برسائے گئے جسے اللہ نے ایک قسم کی بارش سے تشبیہ دی ہے: وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ○ (النمل ۲۷: ۵۸)، ''اور برسائی ان پر ایک برسات، بہت ہی بُری برسات تھی وہ ان لوگوں کے حق میں جو متنبہ کیے جا چکے تھے''۔

● **بارش اور مٹی میں موجود زندہ و مُردہ اجزا:** بارش سے مُردہ پڑی زمین جِلا اُٹھائی جاتی ہے:

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ط (العنکبوت ۲۹:۶۳) اور اگر تم اِن سے پوچھو کس نے آسمان سے پانی برسایا اور اس کے ذریعے مُردہ پڑی ہوئی زمین کو جِلا اُٹھایا تو وہ ضرور کہیں گے اللہ نے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ط اِنَّ الَّذِيْٓ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ط اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ o (حٰم السجدہ ۴۱:۳۹) اللہ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تم دیکھتے ہو زمین سُونی پڑی ہے، پھر جوں ہی کہ ہم نے اس پر پانی برسایا، یکا یک پھبک اُٹھتی ہے اور پھول جاتی ہے۔ یقیناً جو خدا اس مری ہوئی زمین کو جِلا اُٹھاتا ہے، وہ مُردوں کو بھی زندگی بخشنے والا ہے۔ یقیناً وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

آسمان سے پانی برستا ہے تو خشک اور مُردہ پڑی ہوئی زمین کی مٹی کے ذرات پھول جاتے ہیں اور علیحدہ علیحدہ ہوجاتے ہیں۔ زمین کی اس پرت یا تہہ میں موجود لاکھوں بیکٹیریا جو طویل خشک سالی کے باعث مُردہ ہوگئے تھے بارش کے پانی کے باعث 'جاگ' اُٹھتے ہیں۔ ان کی نسل تیز رفتاری سے بڑھتی ہے۔ اپنے جسموں میں ہوا سے نائٹروجن لے کر اس کی تالیف (synthesis) شروع کردیتے ہیں، یوں زمین کی زرخیزی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس مقصد کے لیے بارش کے پانی میں موجود ہائیڈروجن (H_2) اور آکسیجن (O) آئن علیحدہ ہوجاتے ہیں، جو بیکٹیریا کے خشک شدہ جینیاتی تشخص (genetic code) اور ڈی این اے (DNA) کو فعال بنا کر نئی زندگی عطا کرتے ہیں۔ لہٰذا اب یہ بیکٹیریا (مائیکروب) زندہ اور متحرک ہوجاتے ہیں۔ اس طرح اللہ مُردہ کو زندہ کرنے کی صورت پیدا کرتا ہے۔

مٹی میں ننھے حیوانات جو خوابیدہ حالت، یعنی زندگی اور موت کی سرحد پر ہوتے ہیں۔ بارش کا پانی ان میں بھی زندگی کی جولانیاں پیدا کردیتا ہے۔ اس طرح بارش کے بعد بے شمار اقسام

کے رینگنے والے، دوڑنے والے اور اُڑان بھرنے والے کیڑے مکوڑے جگہ جگہ متحرک نظر آتے ہیں۔ زمین میں بارش کے باعث زندگی کی ہماہمی دیکھی جاسکتی ہے۔ اس طرح اللہ مُردہ پڑی زمین کو زندگی سے بھر دیتا ہے۔ مٹی میں مختلف قسم کے پودوں کے بے شمار بیج اور جڑیں بھی خوابیدہ حالت میں دفن ہوتے ہیں۔ بارش کا پانی جوں ہی ان کے اندر جذب ہوتا ہے بیج کا خول نرم پڑتا ہے اور پھٹ جاتا ہے۔ بیج کے اندر کا جنین کا اکھوا نرم مٹی کو پھاڑ کر زمین کی سطح کے اُوپر نرم و نازک پتیوں کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور چہار طرف سبزہ لہلہانے لگتا ہے۔ پودوں کی خشک جڑوں پر موجود کلیاں پانی کے باعث پھوٹتی ہیں اور تازہ دم ہو جاتی ہیں۔

اس طرح اللہ مُردوں کو بھی زندگی بخشنے والا ہے' (حم السجدہ)۔ قربِ آخرت اللہ کا حکم ملتے ہی فرشتہ صور پھونکے گا جو قربِ قیامت کا اعلان ہوگا: ''ہول کھا جائیں گے وہ سب جو زمین و آسمان میں ہیں سوائے ان لوگوں کے جن کو اللہ اس ہول سے بچانا چاہے گا'' (النمل ۲۷:۸۷)۔ ''وہ بس ایک دھماکا ہے جو یکایک انھیں اس حالت میں دھر لے گا جب یہ (اپنے دُنیوی معاملات میں) جھگڑ رہے ہوں گے'' (یٰس ۳۶:۴۹)۔ اور ''جو آسمانوں اور زمین میں ہیں مر کر گر جائیں گے سوائے ان کے جن کو اللہ زندہ رکھنا چاہے''۔ (الزمر ۳۹:۶۸)۔ پھر تیسرا اور آخری صور پھونکا جائے گا جسے سنتے ہی تخلیقِ آدم، یعنی پہلے انسان سے لے کر قیامت تک پیدا ہونے والا ہر انسان ازسرِنو زندہ کیے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کیے جائیں گے۔ اسی کا نام حشر ہے۔ ''اور سب کے سب اللہ واحد القہار کے سامنے بے نقاب ہوکر حاضر کیے جائیں گے'' (ابراھیم ۱۴:۴۸)۔ یہ کس طرح ہوگا؟ اسی طرح ''جس طرح اللہ مُردہ پڑی زمین کو جلا اُٹھاتا ہے''۔

● **بارش کا پانی اور رزق کا انتظام**: بارش ہوتی ہے تو پانی کو ترسی ہوئی زمین پھبک اُٹھتی ہے، مٹی نرم پڑتی ہے اور انسان قسم قسم کے غلّوں اور پھلوں کے بیج لے کر حرکت میں آتا ہے۔ زمین پر ہل چلاتا ہے، بیج بوتا ہے اور پھر کھیت لہلہا اُٹھتے ہیں۔ باغوں میں رنگ برنگے پھول بہار دیتے ہیں۔ درختوں پر پھول اور پھل آتے ہیں۔ انسان خوش اور مطمئن ہوتا ہے کہ اس کے اور اس کے جانوروں کی غذا اور درحقیقت زندہ رہنے کا سامان ہوگیا۔

اللہ کی شان ہے کہ زمین ایک ہے، زمین کے اجزا ایک ہیں، ہوا اور پانی ایک ہیں، مگر

زمین کے کسی قطعے میں گیہوں کی فصل ہے تو کسی دوسرے قطعے میں دوسرے غلّے کی فصل۔ کہیں امرود کے پھل لگے ہوئے ہیں تو کہیں مسمّی اور آم کے پھل ہیں۔ پھر ایک ہی زمین سے اُگنے والے ایک ہی قسم کے پھل کوئی مزے میں بہتر ہے اور کوئی کم تر۔ ''سب کو ایک ہی پانی سیراب کرتا ہے مگر مزے میں ہم کسی کو بہتر اور کسی کو کم تر بنا دیتے ہیں'' (الرعد ۱۳:۴)۔ پھر یہ سب وافر مقدار میں ہیں کہ انسان اور جانوروں کے لیے کافی ہیں مگر انسان اپنی خودغرضانہ حرکتوں سے خود بھی غذائی کمی کا شکار ہوتا ہے اور بعض اوقات قحط کا عذاب اس پر مسلط ہو جاتا ہے۔

یہ بھی اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ پانی ایک ہی ہوتا ہے مگر زمین کی خرابی پیداوار کو متاثر کرتی ہے۔ جو زمین اچھی ہوتی ہے وہ اپنے رب کے حکم سے خوب پھل پھول لاتی ہے اور جو زمین خراب ہوتی ہے اس سے ناقص پیداوار کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ یہ بھی اللہ کی قدرت ہے کہ غلّے کی ایک فصل پیدا ہوتی ہے تو اس کا بیج انسان کی اپنی غذا کے کام آتا ہے اور جب وہی فصل سوکھ جاتی ہے تو فصل کے پتے اور تنے اس کے جانوروں کے کام آتے ہیں۔ پھر مخصوص قسم کے پودوں کی فصل جانوروں کے لیے بھی پیدا کی جاسکتی ہے۔

پودوں میں غذا کہاں سے آتی ہے؟ اللہ نے سبز پودوں میں غذا پیدا کرنے کا دل چسپ مگر پیچیدہ نظام بنایا ہے۔ بارش کا پانی پودوں کی جڑوں کے ذریعے جذب ہو کر شاخوں کے ذریعے پتوں میں پہنچایا جاتا ہے۔ 'سبز پتے' کے ہر خلیے میں سبزینہ نام کا کیمیاوی مادہ ہوتا ہے جو سورج کی روشنی سے قوت حاصل کرتا ہے اور فضا میں موجود کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس پتوں کے سوراخوں کے ذریعے پتے کے خلیوں میں پہنچ جاتی ہے۔ اب پانی کی ہائیڈروجن اور آکسیجن، کاربن ڈائی آکسائیڈ سے کیمیاوی تعامل کرتی ہے جو سبز پتے میں موجود سورج کی روشنی کی قوت کو گلوکوز نام کے کیمیاوی شے میں منتقل کر دیتا ہے۔ گلوکوز اس تعامل کے نتیجے میں تشکیل پاتا ہے۔ یہ گلوکوز بعد میں نشاستے میں تبدیل ہو جاتا ہے جو ایک قوت بردار غذا ہے۔ یہ نشاستہ بیجوں، پھلوں اور جڑوں، پتوں اور شاخوں وغیرہ میں ذخیرہ ہو جاتا ہے۔ بس یہی چیز جب انسان کھاتا ہے تو پانی کے ذریعے حاصل کردہ توانائی انسان اور حیوانوں کے جسموں میں پہنچ جاتی ہے جو زندہ حیات کے اعضا کی حرکت کی بنیاد ہے۔ اگر یہ توانائی جسم میں نہ پہنچے تو جسم مُردہ ہو جائے گا۔

پانی +	کاربن ڈائی آکسائیڈ	پتّے کے سبز ینے میں	گلوکوز +	آکسیجن
بارش کا پانی پودے کی جڑوں کے ذریعے پتّے میں پہنچتا ہے	فضا میں موجود ہوتی ہے اور پتّے کے سوراخوں کے ذریعے اندر آتی ہے	سورج کی روشنی سے حاصل شدہ توانائی	توانائی بردار ہے اور بطور غذا استعمال ہوتا ہے۔	گیس کی شکل میں پتّے سے باہر نکل جاتی ہے اور انسان اور حیوان کے سانس لینے میں استعمال ہوتی ہے۔

سبز پتّے کے سبز ینے میں غذا کے تشکیل پانے کے عمل کا چارٹ

● **بارش کا پانی اور ندی نالے**: جس علاقے میں بارش ہوتی ہے اس میں زمین پر موجود ندی نالے بھر جاتے ہیں اور اپنی ڈھلان کی وجہ سے اور پانی کی وافر مقدار کے باعث اس کو لے کر چلتے ہیں اور میلوں سفر کر کے یہ پانی دریا میں ڈالتے ہیں۔ پھر یہ دریا اسے مزید دُور لے جا کر سمندر میں لا ڈالتے ہیں۔ بارش کے شفاف اور پاک پانی میں اس سفر کے دوران غیر حل شدہ چیزیں، یعنی کوڑا کرکٹ، مٹی، پتھر شامل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح حل شدہ چیزیں نمکیات اور دوسرے کیمیاوی اجزا بھی شامل ہو جاتے ہیں: ''آسمان سے پانی برسایا اور ہر ندی نالہ اپنے ظرف کے مطابق اسے لے کر چل نکلا''۔ (الرعد ۱۳:۱۷)

پھر یہی اللہ کا برسایا ہوا بارش کا پانی زمین کے اندر بہت نیچے تک نہ صرف یہ کہ جذب ہوتا ہے بلکہ زمین کے اندر سوتوں اور دریاؤں کی شکل میں رہتا ہے اور کہیں کہیں چشموں اور جھیلوں کی صورت میں زمین کی سطح پر پھوٹ نکلتا ہے، ان سے انسان کو میٹھا اور شفاف پانی میسر آتا ہے۔ کنویں کھود کر بھی انسان یہ پانی حاصل کرتا ہے۔ بعض جگہ سمندر سے بھی پانی جذب ہو کر زمین کے اندر بھی اندر دُور دُور تک جاتا ہے اور شفاف اور میٹھے چشمے کی صورت میں کسی جگہ بھی نکل آتا ہے۔ خیال ہے کہ آبِ زم زم کا چشمہ بھی بحیرۂ عرب سے آیا ہوا چشمہ ہے۔ ''کیا تم دیکھتے نہیں ہو، اللہ نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کو سوتوں اور دریاؤں کی شکل میں زمین کے اندر جاری کر دیا''۔ (الزمر ۳۹:۲۱)

● **بارش اور سیلاب**: ندی نالوں اور دریاؤں میں بہنے والا یہ پانی جب زیادہ بارش کے باعث بڑی مقدار میں آن پہنچتا ہے تو ان میں سما نہیں پاتا اور ان کے کناروں کو عبور کر کے، یا

اپنے بہنے کی قوت سے کناروں کو توڑ کر اطراف میں تیز رفتاری سے بہہ نکلتا ہے اور انسانی آبادی اور جو چیز بھی اس کے راستے میں آجاتی ہے ان کو اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے۔ انسان کے تعمیر کیے ہوئے بڑے بڑے ڈیم بھی اس کی نذر ہو جاتے ہیں۔ بندتوڑ سیلاب ہو یا دریاؤں کے پشتے توڑ سیلاب، سب اللہ کے حکم سے آتا ہے اور یہ ایک طرح کا اللہ کا عذاب ہے۔ گذشتہ دنوں پاکستان کے مختلف علاقوں میں آیا ہوا سیلاب اسی حکم میں ہے، اور عوام اور خواص کے لیے اللہ کا ایک تازیانہ ہے۔ ملکۂ سبا کے زمانے میں یمن میں ایک بند تھا جو ملک کو سرسبز رکھنے اور غلّہ اور پھل پھواری کے لیے ایک عمدہ نہری نظام سے منسلک تھا جسے اللہ نے ایک بندتوڑ سیلاب کے ذریعے درہم برہم کر دیا۔ ''آخرکار ہم نے ان پر بندتوڑ سیلاب (سیل ارم) بھیج دیا''۔ (السبا ۳۴:۱۰)

● **پانی کے دو ذخیرے**: اللہ رب العزت نے پانی کے دو ذخیرے پیدا فرمائے ہیں: ایک میٹھا اور دوسرا تلخ اور کھاری۔ کھاری پانی کا ذخیرہ سمندروں کی شکل میں بہت بڑا ہے۔ کرۂ ارض پر زمین کی حد بندیاں اللہ نے کچھ اس طرح کی ہیں: کھاری اور میٹھے پانی کے ذخائر علیحدہ علیحدہ ہیں اور ملنے نہیں پاتے۔ لیکن یہ اللہ کی قدرت ہے کہ اس نے سمندر، یعنی کھاری پانی کے اندر میٹھے پانی کے دریا کچھ اس طرح بہائے ہیں کہ یہ دونوں آپس میں گڈمڈ نہیں ہوتے، مکمل طور پر علیحدہ علیحدہ رہتے ہیں۔ ان کے درمیان اللہ نے پردہ حائل کیا ہوا ہے۔

● کون ہے جس نے زمین کو جاے قرار بنایا اور اس کے اندر دریا رواں کیے___ اور پانی کے دو ذخیروں کے درمیان پردے حائل کر دیا۔ (النمل ۲۷:۶۱)

● دو سمندروں کو اس نے چھوڑ دیا کہ باہم مل جائیں۔ پھر بھی ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔ ان سمندروں سے گھونگے اور موتی نکلتے ہیں۔ (الرحمٰن ۵۵:۲۴)

● وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے ایک لذیذ و شیریں، دوسرا تلخ و شور اور دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے۔ ایک رکاوٹ ہے جو انھیں گڈمڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے۔ (الفرقان ۲۵:۵۳)

سولھویں صدی عیسوی میں ترک امیرالبحر نے اپنی کتاب مراۃ الممالک میں خلیج فارس

کے اندر ایسے مقام کی نشان دہی کی ہے اور لکھا ہے کہ وہاں آبِ شور کے نیچے آبِ شیریں کے چشمے ہیں جن سے وہ خود اپنے بحری بیڑے کے لیے پانی حاصل کرتا تھا۔ بحرین کے قریب سمندر کی تہہ میں اس قسم کے بہت سے چشمے کھلے ہوئے ہیں جن سے لوگ میٹھا پانی حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح جبرالٹر کا نیم گہرا علاقہ بحر اٹلانٹک کے پانی اور میڈی ٹرے نین سمندر کے پانیوں کو آزادانہ گڈمڈ ہونے سے روکتا ہے۔ یہ صورت حال واضح طور پر مراکش اور اسپین کے علاقے میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اللہ کی شان کہ ایک فرانسیسی ماہر بحریات جیکو یاوس کاسٹیو (Jaeques Yues Costeau) نے جب اس کا مشاہدہ کیا اور قرآن حکیم آیات (الرحمٰن ۵۵:۱۹-۲۴) اس کے سامنے آئیں تو اس نے بلاتکلف اللہ رب العزت کی بڑائی کا اعلان کیا اور مسلمان ہوگیا۔

موسم کی پہلی بارش: کسی علاقے میں موسم کی پہلی بارش علاقے میں بسنے والوں کے لیے خوشی وانبساط کا باعث ہوتی ہے۔ لڑکے بالے بارش میں نہاتے ہیں اور خوشی مناتے ہیں مگر پہلی بارش نقصان دہ ہوسکتی ہے۔ اس لیے کہ برستا پانی اپنے ساتھ ماحول میں موجود مختلف قسم کی مہلک گیسوں اور مہلک جراثیم کو لیے ہوئے ہوتا ہے جو نہانے والوں کو نقصان پہنچا سکتا ہے، لہٰذا اس بارش میں غسل نہ کرنا بہتر ہے۔

مصنوعی بارش: انسان کوشش کرتا رہا ہے کہ بارش برسانے پر کسی طرح قابو پالے مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ اب تک کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ بخارات سے جو پانی بردار بادل بن جاتے ہیں ان پر بعض کیمیاوی چیزوں کا چھڑکاؤ کیا جاتا ہے، بادل اپنا پانی برسا دیتے ہیں لیکن یہ کام کسی محدود علاقے پر ہی کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے اس پر بڑے اخراجات اُٹھانے پڑتے ہیں۔ انسان کے لیے بارش کے سارے عمل پر قابو پانا تقریباً ناممکن ہے۔

قربانی: مسلمان کو مسلمان بناتی ہے

(آخری قسط)

خرم مرادؒ

غیر مادّی قربانیاں

وقت، دولت، زندگی اور اسی طرح کی دیگر چیزیں قربان کرنا، کوئی شک نہیں کہ، بڑا دُشوار کام ہے، مگر ان چیزوں کے مادّی اور محسوس اشیا ہونے کی وجہ سے ان کی قربانی میں کئی لحاظ سے زیادہ مشکل پیش نہیں آتی۔ آپ جو کچھ بھی قربان کریں گے، وہ نظر آنے والی چیز ہوگی۔ جو قربانی آپ دیں گے اُسے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اطمینان کرسکیں گے۔ علاوہ ازیں بڑے پیمانے پر ایسی قربانیوں کی ضرورت بالعموم کسی بحران یا آزمایش کے وقت پیش آتی ہے۔ مصیبت اور آزمایش کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں، جو انسان کے اندر کے جذبات کو تحریک دے کر اُس سے اپنی بہترین چیزیں باہر نکلوالاتی ہیں۔ ایسے مواقع پر آپ صورتِ حال سے باخبر ہوتے ہیں، آپ کو احتیاجات کی فوری تکمیل کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے اور آپ جذبات سے مغلوب بھی ہوتے ہیں۔ نیز ایسی قربانیاں بنیادی طور پر ذاتی نوعیت کی قربانیاں ہوتی ہیں، اپنی مرضی سے دی جاتی ہیں، بالعموم ان قربانیوں سے باہمی تعلقات کا پیچیدہ جال نہیں الجھتا۔

وہ تو غیر مادّی اور غیر محسوس قسم کی اشیا کی قربانیاں ہیں جو نہ صرف زیادہ مشکل ہیں، فرد اور معاشرے کے لیے زیادہ اہم ہیں اور جدوجہد میں کامیابی کے لیے زیادہ ضروری ہیں، لیکن انھی قربانیوں سے صرفِ نظر کرنے، یا انھی قربانیوں کو نظرانداز کردیے جانے کے امکانات بھی نسبتاً زیادہ ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات ان قربانیوں کو قربانی سمجھا ہی نہیں جاتا۔ ان اشیا کی قربانی کو نظرانداز کیے جانے کی وجہ یہ ہے کہ آپ جس چیز کی قربانی دے رہے ہیں اُس کی جڑیں آپ کے دِل و دماغ کی

پہنائیوں میں پیوست ہیں، وہ ٹھوس اور نظر آنے والی چیزیں نہیں ہیں، آپ کو اُن کی قربانی دیتے ہوئے دیکھا نہیں جاسکتا۔ اور یہ قربانیاں صرف بحران و آزمایش کی گرما گرمی میں نہیں، بلکہ روزمرہ زندگی میں، بغیر کسی کو دکھائے اور بغیر کسی کے علم میں لائے، ہر روز دی جاتی ہیں۔

اجتماعیت کی زندگی بسر کرتے ہوئے اللہ کی راہ میں جدوجہد کے وقت ایسی قربانیوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ اس نوعیت کی قربانیاں ہیں کہ آپ بمشکل ہی ان کو قربانیاں سمجھیں گے۔ مگر ایسی قربانیوں کے بغیر کوئی مضبوط ہم آہنگ اجتماعی زندگی وجود میں آسکتی ہے، نہ کامیابی کی اُمید کے ساتھ کوئی جدوجہد کی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر اپنی پسند و ناپسند کو لے لیجیے۔ دولت کی طرح اس کا حساب نہیں لگایا جاسکتا، مگر افراد، اشیا اور موقف سے متعلق اپنی پسند و ناپسند کی آپ کو قربانی دینی ہوگی۔ ایسی غیر محسوس اشیا کی قربانی دینے کے لیے درحقیقت نسبتاً بڑے جذبۂ قربانی کی ضرورت پیش آئے گی۔ اللہ کے کام میں انسان کو نہ صرف اپنی جان و مال، وقت اور وسائل کی قربانی دینی پڑتی ہے، بلکہ اپنی پسند و ناپسند اور اپنی محبت و نفرت کی بھی قربانی دینی پڑتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جس نے صرف اللہ کی خاطر محبت کی اور صرف اللہ کی خاطر نفرت کی، اُس نے اپنا ایمان مکمل کرلیا''۔ (ابوداؤد، ترمذی)

جب ہم صحابۂ کرام کا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ: اللہ اُن سے راضی ہوا، اور وہ اللہ سے راضی ہوئے (رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ) کیوں؟ کیوں کہ اُنھوں نے اپنی ذات کو اس حد تک فنا فی اللہ کردیا تھا کہ اللہ کی پسند اُن کی پسند، اور اللہ کی ناپسند اُن کی ناپسند بن گئی تھی۔ اُنھوں نے نہ صرف اپنی جان و مال کو اللہ کے سپرد کردیا تھا بلکہ اپنی پوری ذات اللہ کے حوالے کردی تھی۔

اس اہم ترین نوعیت کی قربانی کو عموماً ہم نظرانداز کردیتے ہیں جس کے بغیر اتحاد و اتفاق کے مسالے سے تشکیل پانے والی اُس اجتماعیت کا بننا انتہائی مشکل ہے جو تنہا اللہ کے کام کو آگے بڑھا سکتی ہے۔ آیئے ہم قربانی کی ان اقسام پر ایک اجمالی نظر ڈال لیں۔ ان میں محبت، نفرت، رشتہ داریاں، پسند و ناپسند، ترجیحات و تعصّبات، آرزو اور اُمنگ، آرام و راحت، اُمیدیں اور توقعات، رسوم و رواج، اقدار اور رویّے، عہدہ و منصب یا محض اَنا اور خود پسندی شامل ہیں۔

کنبے کی محبت

کنبے کی محبت دُنیا کا طاقت ور ترین اور غالب ترین رشتہ ہے۔ مہد سے لحد تک والدین کی محبت، بچوں کی محبت، بیوی کی محبت، خاوند کی محبت، بھائیوں اور بہنوں کی محبت، بلکہ دوسرے رشتہ داروں کی محبت بھی ہماری زندگی کا محور بنی رہتی ہے۔ یہ محبتیں ہمارے تمام تعلقات پر غالب رہتی ہیں۔ عام طور پر ہماری زندگی، ہمارا روزگار اور مال و متاعِ دُنیا کا حصول اُنھی کی محبت کی خاطر اور اُنھی کی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے وقف ہو جاتا ہے۔

ہم اپنے دل و دماغ، اپنی توجہ اور وفاداری اور اپنے وقت اور دولت پر کسی اور حق سے پہلے عام طور پر اس محبت کا حق تسلیم کرتے ہیں۔ کنبے کی محبت کا تعلق ہمیں جس طرح جوڑے رکھتا ہے اُس طرح کوئی اور تعلق نہیں جوڑ سکتا۔ ہم اکثر لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ 'مجھ پر سب سے پہلا حق میرے گھرانے کا ہے' یا کسی کو اس فخر کا اظہار کرتے دیکھتے ہیں کہ 'میری وفا اور میرا اخلوص سب کچھ اپنے خاندان کے لیے وقف ہے'۔ اس کے معقول دلائل ہیں۔ خاندان قدیم ترین اور اہم ترین انسانی ادارہ ہے۔ انسان نے اب تک جن تہذیبوں اور ثقافتوں کی تشکیل کی ہے، یہ اُن سب کا سنگِ بنیاد ہے۔ ایسی مؤثر اور گہری محبت اور ایسی غالب وفاداری کے بغیر تہذیبی اقدار، معیارات اور طور طریقے اگلی نسل کو منتقل کیے جاسکتے ہیں، نہ ان کو محفوظ اور برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ کنبے کے بغیر آدمی، آدمی ہی نہیں رہتا، برباد ہو جاتا ہے۔ پھر کنبے کی محبت بھی اللہ کی راہ میں قربان کردینے کی ضرورت کیوں ہے؟ اس کے واضح دلائل ہیں:

اوّل: آپ اُس وقت تک اپنی ذات کو اللہ کے سپرد نہیں کر سکتے جب تک کہ آپ کی زندگی، آپ کی محبت اور آپ کی وفاداری پر اللہ کا حق سب سے مقدّم اور سب سے اہم حق نہ بن جائے۔ یوں کنبے کا حق اللہ کے حق کا مطیع ہوگا۔ بصورتِ دیگر یہ امکان ہے کہ کنبے کی محبت ایک صاحبِ ایمان کو اللہ کے احکام کے خلاف طرزِ عمل اختیار کرنے پر مائل یا مجبور کردے۔

دوم: کنبہ ہمیشہ سے وہ مضبوط ترین قلعہ رہا ہے جس میں مستحکم اقدار، عقاید، رسوم و رواج اور طرزِ حیات وغیرہ مورچہ بند رہتے ہیں۔ مسلمان بننے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنی ذات میں اور اپنے معاشرے میں ایک تبدیلی لانا شروع کرتے ہیں۔ آپ مستحکم بنیادوں پر قائم طرزِ زندگی کو

چیلنج کرنا شروع کرتے ہیں اور اُسے اُکھاڑ پھینکنے کا آغاز کرتے ہیں۔ باپ دادا کے طور طریقوں سے بغاوت اور اُن میں تبدیلی لانے کے خلاف پہلی مزاحمت خاندانی محبت کی حدوں کے اندر ہی سے پیدا ہوگی۔ یہ بالکل فطری بات ہے۔

سوم: جو کچھ آپ کے پاس ہے اُسی کے بل بوتے پر آپ جہاد کا عزم کرتے ہیں۔ آپ کی ہر چیز، بشمول خاندانی محبت کے حق پر، جہاد کا حق دیگر تمام حقوق سے فائق ہونا چاہیے۔ کوئی چیز آپ کو جہاد کے راستے سے منحرف نہ کر سکے۔ خاندانی محبت اگر کوئی رُکاوٹ نہ بنے، تب بھی آپ کو اپنے فرض کی تکمیل کی خاطر کئی طریقوں سے یہ قربانی دینی پڑے گی۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم ہمیں آگاہ کرتا ہے: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ (الانفال ۸: ۲۸)، ''اور جان رکھو کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد حقیقت میں سامانِ آزمایش ہیں اور اللہ کے پاس اجر دینے کے لیے بہت کچھ ہے''۔ اور ہمارے سامنے یہ بنیادی گہرا سوال رکھتا ہے کہ تُم کس سے زیادہ محبت رکھتے ہو؟ اللہ سے یا......؟

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (التوبہ ۹:۲۴)، اے نبیؐ! کہہ دو کہ اگر تمھارے باپ، اور تمھارے بیٹے اور تمھارے بھائی، اور تمھاری بیویاں، اور تمھارے عزیز واقارب، اور تمھارے وہ مال جو تُم نے کمائے ہیں، اور تمھارے وہ گھر جو تُم کو پسند ہیں، تُم کو اللہ اور اُس کے رسولؐ اور اُس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمھارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔

خاندانی محبت کی قربانی مختلف صورتوں میں دی جاسکتی ہے، اِس کا انحصار اِس بات پر ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت و فرماں برداری اور اُس کی رضا کے حصول کی جدوجہد میں کس انداز سے آڑے آتی ہے۔ پہلی مثال یہ ہے کہ خاندانی محبت مطالبہ کرتی ہے کہ والدین، خاندان کے بڑوں،

باپ دادا کے طور طریقوں یا رسوم و رواج اور معاشرے کی اطاعت کی جائے۔ اگر ایسی اطاعت اللہ کی اطاعت سے متصادم ہو تو اسے ترک کر دینا چاہیے۔ آپ کو اپنی عقل، اپنے ضمیر، اپنے عقیدے اور اللہ کی طرف سے آنے والی ہدایت کا کہا ماننا چاہیے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَ نَا ط اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ○ (البقرہ ۲:۱۷۰)، ان سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کیے ہیں اُن کی پیروی کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اُسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اچھا، اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کچھ بھی کام نہ لیا ہو اور راہِ راست نہ پائی ہو تو کیا پھر بھی یہ انھی کی پیروی کیے چلے جائیں گے؟

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ط وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ط اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ○ (العنکبوت ۲۹: ۸)، ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے۔ لیکن اگر وہ تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے (معبود) کو شریک ٹھیرائے جسے تو (میرے شریک کی حیثیت سے) نہیں جانتا تو ان کی اطاعت نہ کر۔

مزید یہ کہ آپ جن سے محبت کرتے ہیں وہ آپ کے عقیدے پر ایمان لانے سے انکار کرسکتے ہیں، یا وہ اللہ اور اُس کے کام کی کھلی مخالفت پر اُتر سکتے ہیں۔ ایسے مخالف رشتہ دار حق کی آواز کو دبانے کی کوشش کریں گے، آپ کا تمسخر اُڑائیں گے اور تضحیک کریں گے، آپ کو ستائیں گے، گھر سے نکال دیں گے اور آپ کو خاندان سے خارج کر دیں گے۔ آپ کو ایسے ضرر رساں اور مخالف ارکانِ خاندان سے اپنی محبت اور تعلّق کے تمام جذبات کی قربانی دینی ہوگی۔ اللہ کی محبت اور اللہ کے دُشمنوں کی محبت ساتھ ساتھ نہیں رہ سکتی۔ اُن کی محبت سے مکمل دست برداری جیسی بڑی قربانی دے کر ہی آپ اپنے عقیدے کو اپنے دل میں پختہ کر سکتے ہیں اور اپنا شمار اللہ کی جماعت (حزب اللہ) میں کروا کر اُس کی رضا و خوش نودی اور اُس کی جنت کا انعام حاصل کر سکتے ہیں۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی مثال لیجیے، جو اللہ کی راہ میں قربانی کا نمونۂ کامل تھے۔ سب سے

پہلے اُنھیں اپنے والد کو چھوڑنا پڑا، حتیٰ کہ اُن کے لیے دُعاے مغفرت کرنے سے بھی اللہ کے حکم پر دست کش ہوگئے، اور آخرکار اللہ کے حضور اپنے لختِ جگر کا ذبیحہ پیش کرنے کو بھی تیار ہوگئے۔ یا سیدنا لوط علیہ السلام کی مثال لیجیے جنھیں اپنی بیوی سے قطع تعلّق کرنا پڑا، کیوں کہ وہ اُن لوگوں کی ہم درد تھی جنھوں نے سیدنا لوط علیہ السلام کی اُس دعوت پر کان دھرنے سے انکار کر دیا تھا جو ایک اللہ کی بندگی اختیار کرنے کے لیے اُن کو دی جارہی تھی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقا رضی اللہ عنہم کی مثال لیجیے، باپ بیٹوں کے سامنے صف آرا تھے اور بیٹے باپ کے سامنے، حتیٰ کہ میدانِ جنگ میں بھی، مگر اُن کے پاے استقامت میں لغزش نہیں آئی۔

وہ لوگ جو ایمان لانے سے محض انکار کرتے ہیں اور مخالفانہ سرگرمیوں میں فعّال نہیں ہوتے، اُن کے معاملے میں آپ کی قربانی کی نوعیت قدرے مختلف ہوتی ہے۔ اُن سے آپ کو اپنی دوستی ختم کر دینی چاہیے، لیکن سلوک عادلانہ اور کریمانہ کرنا چاہیے۔ اُلفت و محبت کے تمام تعلقات کا خاتمہ انتہائی اقدام ہے، مگر ان تعلقات سے چھلانگ یک لخت ہی لگانی ہوگی۔ جو لوگ آپ کے عقائد کو پسند نہیں کرتے یا اُن سے اتفاق نہیں رکھتے، اور اس بات کو راز بھی نہیں رکھتے، ایسے اعزہ و اقارب کے ساتھ مستقلاً رہنا آپ کو زیادہ مشکل میں مبتلا کرسکتا ہے اور بہت بڑی قربانی کا تقاضا کرتا ہے۔ کیوں کہ جب آپ کے عقیدے اور ایمان کو بُرا بھلا کہا جائے گا تو آپ کو شدید اذیت ہوگی اس کے باوجود آپ کو ان کے ساتھ تحمل و برداشت سے پیش آنا ہوگا۔

ضروری نہیں کہ آپ کے اہلِ خاندان آپ کے نصب العین کی مخالفت ہی کریں، یا اس معاملے میں غیر جانب دار رہیں، وہ ہمدرد بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کے باوجود اُن سے محبت کے تقاضوں اور اللہ سے محبت کے تقاضوں میں ٹکراؤ، یا اختلاف پیدا ہوسکتا ہے۔ ایسی صورتوں میں یہ بات نہ بھولیے کہ خود اچھے مسلمانوں سے محبت بھی بعض اوقات اللہ کی محبت کی راہ سے بھٹکا سکتی ہے، لہٰذا قربانی کی ضرورت وہاں بھی پیش آتی ہے۔

اکثر اوقات آپ کو مختلف اقسام کے نرم و نازک اور لطیف دباؤ کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔ ان کی مزاحمت کے لیے آپ کو متعدد طریقوں سے مسلسل قربانیاں دینی ہوں گی۔ ان میں سے تمام صورتیں اتنی سادہ اور واضح نہیں ہوتیں کہ آپ آسانی سے کسی فیصلے پر پہنچ جائیں۔ کبھی ان کی

ناپسندیدگی اور نامنظوری آپ کے سامنے بظاہر یا بباطن بڑے سادہ انداز میں پیش کی جائے گی، مگر اسے بھی رد کرنا ہوگا۔ بعض اوقات التجائیں اور مطالبات پیش کرتے ہوئے محبت کا واسطہ دیا جائے گا، حقوق کا واسطہ دیا جائے گا اور اختیارات کا واسطہ دیا جائے گا، سب کا اسلام سے جواز بھی پیش کیا جائے گا، آپ کو ان سب کا مقابلہ مناسب طریقے سے کرنا ہوگا۔ بیوی بچے محبت اور التفات کے طالب ہوں گے، آپ کو سب میں توازن رکھنا ہوگا۔

ایسی صورت میں آپ کو اُنھیں خوش رکھنے کی ضرورت پر اللہ سے اپنے عہد کو غالب رکھنا ہوگا، اُن کا دِل نہ دُکھائیں، اُنھیں مایوس نہ کریں اور اُن کی اُمیدوں کو رد نہ کریں۔ بصورتِ دیگر آپ کو اُن سے ملنے والی مدد اور تقویت سے دست کش ہو جانا پڑے گا اور اُن کی گرم جوشی اور جذباتی محبت سے محرومی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ آپ کو بڑے پیچیدہ فیصلے کرنے ہوں گے کیوں کہ اگر وہ اللہ کے کام میں آپ کی راہ کی رکاوٹ بن گئے تو ایک مقام پر پہنچ کر آپ کو اپنے ان فرائض ذِمہ داریوں، خدمت گزاری اور اُن کے حکم کی تعمیل سے ہاتھ اُٹھا لینا ہوگا۔

دوستی

افراد کے مابین قائم ہونے والے الفت و محبت کے رشتوں میں سے ایک بڑا رشتہ دوستی کا تعلّق ہے۔ دوستیاں ہم مزاجی، مشترکہ مفادات و مقاصد اور مشترکہ اہداف کی بنیاد پر تشکیل پاتی ہیں۔ مسلمان کی حیثیت سے آپ کا ایک ہی ہدف اور مقصد ہے: اپنے پورے وجود کو مکمل طور پر اللہ کے سپرد کر دینا، لہٰذا بہت سی دوستیوں کی آپ کو قربانی دینی ہوگی اور اسی طرح بہت سی دُشمنیوں اور نفرتوں کو بھی ختم کرنا ہوگا۔ اس کے برعکس نئے دوست بنانے ہوں گے۔ کوئی شخص جسے آپ کبھی پسند نہیں کرتے تھے، اُس کے لیے آپ کے دِل میں جگہ نکل آئے گی، وہ آپ کو عزیز ہو جائے گا۔

خاندانی رشتے ہوں یا دوستیاں، سماجی تعلقات زندگی کی ضرورتوں کی تکمیل کرتے ہیں۔ اپنی مدد و تعاون سے وہ آپ کو ضروری کمک اور طاقت فراہم کرتے ہیں۔ آپ کو ایسی حیات بخش کمک اور سماجی تقویت کی قربانی دینی ہوگی کیوں کہ دوستیاں ٹوٹ جاتی ہیں، رشتے بکھر جاتے ہیں اور حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا جاتا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ جو صادق و امین اور قابلِ احترام رہنما تھے، یکا یک (نعوذ باللہ) 'فاترالعقل'، 'دیوانے' اور 'لوگوں کے دُشمن' کہے جانے لگے تھے۔

نقطۂ نظر اور موقف

دوستیوں اور رشتہ داریوں کی طرح آپ کی پسند و ناپسند کا بھی آپ کی زندگی کے ہر حصے پر غالب اثر پایا جاتا ہے۔ اس میں آپ کے خیالات، آپ کا نقطۂ نظر، آپ کا ذوق، آپ کا مزاج، آپ کے جذبات واحساسات اور آپ کے رویّے اور آپ کا برتاؤ بھی شامل ہے۔ بسا اوقات ان میں سے ہر ایک کی اپنے اپنے طریقے سے قربانی دینی پڑتی ہے۔

اپنا نقطۂ نظر اور اپنے خیالات آپ کو ہمیشہ عزیز رہتے ہیں۔ اپنے نظریے سے آپ کی جذباتی وابستگی صرف اسی صورت میں پختہ ہوتی ہے جب آپ اپنی زندگی کے نصب العین سے عہدِ وفا استوار کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد آپ کے اندر صحیح اور غلط یا حق اور باطل میں امتیاز کی ایک طاقت وَر حِس پیدا ہو جاتی ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہر وقت یہ خیال آپ کے ذہن میں رہتا ہے کہ اندازِ نظر صرف ایک ہی ہو سکتا ہے: صحیح یا غلط، اور آپ کو ہمیشہ درست طرزِ فکر اختیار کرنا ہے۔ تاہم آپ کے نظریات، کسی خاص معاملے پر آپ کی حکمت عملی اور آپ کے کام کرنے کا طریقہ، ہو سکتا ہے کہ دوسروں کے لیے قابلِ قبول نہ ہو۔ ایسی صورت میں آپ کو اُنھیں چھوڑنا ہوگا، آپ کو اپنے ان نظریات سے علیحدگی اختیار کرنی ہوگی، یا اُن نظریات کے خلاف کام کرنا ہوگا۔ لیکن جب تک آپ کسی معاملے میں اللہ کے کسی صریح حکم کی خلاف ورزی نہ دیکھیں، آپ کو اپنی رائے کی قربانی دینی ہے۔ اجتماعیت کی زندگی کو طاقت ور بنانے کے لیے دی جانے والی یہ قربانی مال و دولت کی قربانی سے زیادہ اہم ہے۔

جذبات و احساسات

بعینہٖ آپ کو اپنے جذبات و احساسات بھی بے حد عزیز ہوتے ہیں۔ بسا اوقات آپ کو اپنے ایسے مشاغل ترک کر دینے پڑتے ہیں، جو اللہ کی رضا و خوش نودی کے کام نہیں ہیں، خواہ وہ آپ کو مرغوب ہوں، آپ اُن میں کشش محسوس کرتے ہوں اور اُنھیں مفید سمجھتے ہوں، جب کہ بعض اوقات صرف اللہ کی رضا و خوش نودی کی خاطر آپ کو ایسے کام کرنے پڑتے ہیں جنھیں آپ پسند نہیں کرتے اور جو آپ کے مزاج کے خلاف ہیں۔ کئی مواقع پر آپ کو اپنے بولنے کی خواہش کو دبانا ہوگا اور خاموش رہنا ہوگا خواہ اپنی بات کہہ دینے کا کتنی ہی شدّت سے دِل کیوں نہ چاہ رہا ہو۔

اور کسی موقع پر آپ کا خاموش رہنے کا جی چاہ رہا ہوگا مگر بولنا پڑے گا۔ آپ کو شدید غصہ آئے گا اور انتقام کا جذبہ جوش مار رہا ہوگا، برا بھلا سنانے کی خواہش پیدا ہورہی ہوگی، مگر آپ کو اپنی زبان قابو میں رکھنی ہوگی۔ بعض مواقع پر آپ کو تنہائی اور سکون کی ضرورت محسوس ہورہی ہوگی مگر آپ کو بھرپور سماجی سرگرمیوں اور عوامی رابطوں میں منہمک ہونا پڑے گا۔ اور بعض اوقات آپ کا دل لوگوں سے ملنے جُلنے کو چاہ رہا ہوگا، مگر اکیلے رہنا پڑے گا۔ آپ کے اندر 'کچھ حاصل کر لینے' یا 'کچھ بن جانے' کی اُمنگ موجیں مار رہی ہوگی، مگر آپ کو اپنی ان آرزوؤں سے مکمل طور پر دست بردار ہونا پڑے گا۔ آپ کو اپنی ذاتی خواہشات اور ذاتی منصوبے ردّی کی ٹوکری کی نذر کر دینے ہوں گے۔

ذوق اور مزاج

بہت سے عام معاملات میں بھی آپ کو اپنے ذوق اور مزاج کی قربانی دینی ہوگی۔ آپ کو ایسے انداز سے زندگی بسر کرنے، کھانے پینے، سونے اور پہننے پر مجبُور ہونا پڑے گا جو آپ کو پسند نہیں، آپ کے مزاج کے مطابق نہیں، یا آپ کی ترجیحات اور آپ کے طرزِ زندگی سے لگّا نہیں کھاتا۔ آپ کو یہ طرزِ حیات قبول کرنا ہوگا، بغیر ناک بھوں چڑھائے، برضا ورغبت، دوسروں کی دِل شکنی کیے بغیر اور اُن کے لیے مشکلات اور انتشار پیدا کیے بغیر۔

اَنا اور خود پسندی

اور آخرکار آپ کو اپنی انا، اپنی خود پسندی، اپنے متعلّق حسین تصورات اور ان تصورات سے اپنی محبت، سب کچھ قربان کر دینا ہوگا۔ یہ ظاہری اور باطنی بہت سی خرابیوں کی جڑ ہے۔ اپنے آپ کو فنا کر دینا صرف راہِ سلوک ہی کا ایک مرحلہ نہیں، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رستے پر چلنے کے لیے جو واحد چیز درکار ہے وہ بھی یہی ہے کہ آپ کو اپنی اَنا، اللہ کی رضا کی خاطر فنا کر دینی ہوگی۔ ہماری خود پسندی، ہمارے نزدیک اتنی اہم چیز بن جاتی ہے کہ اس کے نتیجے میں ضد، ہٹ دھرمی، خودسری، خودستائی، ڈھٹائی، اور دوسروں کی تذلیل جیسی بُری عادات پروان چڑھ جاتی ہیں۔ اپنی اَنا اور خود پسندی کی قربانی دینا زندگی کا سب سے کٹھن کام ہے، مگر یہ کرنا ہی ہوگا۔

مسلسل اور دائمی قربانیاں

بعض قربانیاں زندگی میں ایک ہی بار دینی ہوتی ہیں، جیسے جان کی قربانی۔ کچھ قربانیاں بہت معمولی ہوتی ہیں مگر مسلسل دینی پڑتی ہیں۔ ان کے بعض غیر محسوس پہلوؤں کے سبب ان کا تسلسل ہی انھیں اہم بنا دیتا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ ان کے معاملے میں آپ کو ہر وقت چوکس اور چوکنا رہنا پڑتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کا موقع آئے اور آپ اونگھ رہے ہوں، بے اعتنائی سے بیٹھے ہوئے ہوں، غفلت اور بے دھیانی کی کیفیت میں ہوں، یا موقع پہچان نہ سکیں۔ دوسرے یہ کہ ان قربانیوں کے لیے عزمِ مسلسل و متواتر درکار ہوتا ہے، جس کو برقرار رکھنے کے لیے زیادہ جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ تیسرے یہ کہ یہ قربانیاں اتنی چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں کہ ان کے بل پر کوئی سُورما نہیں بن سکتا، مگر کردار سازی، معاشرتی نظم و ضبط اور کامیابی کے لیے ان کی اہمیت کسی لحاظ سے کم نہیں۔ مسلسل گرنے والا پانی کا ایک معمولی قطرہ بھی پتھر کی چٹان میں سوراخ کر دیتا ہے۔ چوتھے یہ قربانیاں بحران اور مصیبت کے وقت نہیں طلب کی جاتیں، بلکہ ان کی ضرورت عام حالات اور روزمرہ زندگی میں پیش آتی ہے۔ اسی وجہ سے معمولی ہونے کے باوجود یہ قربانیاں پیش کرنا بہت دُشوار کام ہے۔ کیوں کہ شدید بحران کے وقت، جب کسی بڑے چیلنج کا سامنا ہو تو کوئی بڑا اعزاز ملنے کی توقع پر اپنی اندرونی صلاحیتوں کو اُبھارنا، اپنے عزم و ارادے کو جگانا اور اپنی بہترین مساعی کو بروے کار لے آنا نسبتاً سہل ہوتا ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ ایک طرح سے آپ کو زندگی کے ہر لمحے چھوٹی چھوٹی ـــــ بہت چھوٹی چھوٹی ـــــ قربانیاں دینی پڑتی ہیں، کیوں کہ زندگی کے ہر ہر قدم اور ہر ہر ثانیے میں آپ کو دو چیزوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑتا ہے، خواہ یہ کتنا ہی چھوٹا معاملہ کیوں نہ ہو۔ اللہ کی رضا و خوش نودی کی خاطر کسی بھی پہلو کا انتخاب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کسی نہ کسی چیز کی قربانی دینے کا فیصلہ کر رہے ہیں، یہاں تک کہ اگر آپ نمازِ فجر ادا کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو آپ اپنی نیند اور گرم بستر کی قربانی دے رہے ہوتے ہیں۔

ایک ایسے پہاڑی راستے پر ڈرائیونگ کرتے ہوئے جس میں گہری کھائیاں آتی ہوں، آڑی ترچھی ڈھلوانیں ہوں اور اندھے موڑ پڑتے ہوں، آپ زیادہ محتاط رہیں گے تاکہ محفوظ ڈرائیونگ کر سکیں اور تمام مشکلات سے نبرد آزما ہو سکیں۔ مگر کسی ایسے راستے پر جو ہموار ہو، حادثات

سے محفوظ ہو، اُس میں کسی موڑ کا سامنا نہ کرنا پڑتا ہو، کوئی رکاوٹ نہ پیش آتی ہو اور کوئی اُترائی یا چڑھائی نہ ہو تو اُس راستے پر آپ کے بے پروائی اور غفلت سے ڈرائیونگ کرنے کے امکانات زیادہ ہیں۔ یوں آپ کو کوئی حادثہ پیش آ سکتا ہے، یا آپ اپنا کوئی موقع ضائع کر سکتے ہیں، یا اپنے راستے سے بھٹک سکتے ہیں، یا بے دھیانی میں اپنی منزل سے دُور نکل سکتے ہیں۔

گویا روزمرہ زندگی میں قدم قدم پر قربانیاں دینی پڑتی ہیں___ گھر میں، دفتر میں، بازار میں، معاشرتی تعلقات میں، تنظیمی سرگرمیوں میں، یہاں تک کہ تنہائی میں بھی___ جن سے غفلت ہوسکتی ہے۔ یہ قربانیاں دینا زیادہ دُشوار ہے، محض اِس وجہ سے کہ انھیں قربانی تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔

کامیابی کے امکانات کی عدم موجودگی میں

جب دُنیاوی کامیابی سامنے نظر نہ آتی ہو تو ایسی صورت میں دی جانے والی قربانیوں کی مزید جہتیں سامنے آتی ہیں۔ جب آپ کی جدوجہد کے ثمربار ہونے کے امکانات نظر آرہے ہوں تو نسبتاً زیادہ آسان ہوتا ہے کہ آپ اپنا وقت، اپنا مال اور اپنی زندگی قربان کردیں، اپنی رائے سے دست بردار ہوجائیں، ایسے لوگوں کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ ہوجائیں جن کو آپ پسند نہیں کرتے یا اُن طریقوں کو اختیار کرلیں جو ذاتی طور پر آپ کو ناپسند ہیں۔ مگر جب کامیابی کے امکانات موہوم یا معدوم ہوں تو یہ تمام کام انتہائی مشکل ہوجاتے ہیں۔ مایوسی کے لمحات میں، جب کامیابی کی کوئی اُمید نظر نہ آرہی ہو یا شکست واضح انداز سے دکھائی دے رہی ہو، زیادہ امکان یہی ہوتا ہے کہ لوگ اپنے وقت اور مال سے چمٹے رہیں، اپنی رائے پر اصرار کریں اور اپنے ناپسندیدہ افراد، یا طور طریقوں کو ایک تنازع بنا کر کھڑا کردیں۔ ایسی صورتوں میں دی جانے والی قربانیوں کا بہت بڑا اجر ہے۔

قربانی کیسے دی جائے؟

آپ اپنے اندر کی اُن صلاحیتوں کو کیسے بیدار کریں گے جو آپ میں قربانی کا جذبہ اور استعداد، پیدا کریں، پروان چڑھائیں اور برقرار رکھیں؟ آپ سے جو قربانی طلب کی جائے گی اُس کے لیے اپنے آپ کو کس طرح آمادہ و تیار کریں گے؟

ان میں سے کچھ طریقوں سے تو آپ کو قربانی کی اقسام پر بحث کے دوران ہی آگاہی ہوچکی ہے۔ تاہم کچھ بنیادی اندرونی صلاحیتیں ایسی ہیں جن پر زیادہ زور دینے اور جنھیں ہمیشہ یاد

رکھنے کی ضرورت ہے اور جو آپ کو خود اپنے اندر پیدا کرنی ہیں۔ مگر سب سے پہلے ہم چند ایسے بنیادی اُصولوں کو دُہرا لیتے ہیں جن پر ان صلاحیتوں کا انحصار ہے:

اوّل، قربانی اُسی صورت میں قربانی کہلائے گی جب آپ کوئی ایسی چیز قربان کریں جس کی آپ کے نزدیک کوئی قدر و قیمت ہے، یا جسے آپ عزیز رکھتے ہیں۔ ایسی چیزوں کی قربانی آپ اُن سے زیادہ قیمتی، زیادہ محبوب، زیادہ پسندیدہ یا زیادہ ضروری اور زیادہ اہم چیزوں کی خاطر دیتے ہیں۔

دوم، آپ جس چیز کی قربانی دیتے ہیں اُس کی ظاہری شکل خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو ـــــ وقت، مال، زندگی، پسند و ناپسند، نقطۂ نظر ـــــ آپ اصل قربانی ان چیزوں کی نہیں، بلکہ ان چیزوں کی محبت اور آپ کے نزدیک ان چیزوں کی جو قدر و قیمت ہے، اُس کی قربانی دیتے ہیں۔

سوم، اُس صورت میں ان چیزوں کی قربانی دینے پر آپ کے عزم و آمادگی میں مزید اضافہ ہوگا جب اللہ کی محبت اور اُس کے انعامات کی قدر و قیمت آپ کی نظر میں انتہائی شدّت و قوت کے ساتھ بڑھتی جائے گی اور جن چیزوں کی قربانی آپ دے رہے ہیں، وہ ان کے مقابلے میں آپ کو بے قیمت اور حقیر نظر آنے لگیں گی۔

اللہ سے محبت

محبت ہر شے کی بنیاد ہے۔ لہٰذا آپ بخوبی ادراک کر سکتے ہیں کہ قربانی دینے کے لیے جو اندرونی استقامت درکار ہے، اُس کے لیے آپ کو کس چیز کی ضرورت ہے ـــــ اللہ سے محبت کی۔ آپ کے دل میں اللہ کی محبت کتنی ہے؟ کیا آپ دُنیا کی ہر چیز سے زیادہ اُس سے محبت کرتے ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن کہتا ہے: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ (البقرہ ۲:۱۶۵)، ''ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں''۔

یہی وجہ ہے کہ ہر مسلمان کو ایک سادہ مگر انتہائی معنی خیز سوال کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ تمھیں کون زیادہ عزیز ہے؟ اللہ، اُس کا رسولؐ اور اُس کی راہ میں جہاد یا باپ، بیٹے، بیویاں، بھائی، مال و دولت، گھربار، تجارت اور کاروبار؟ (التوبہ ۹:۲۴)۔ صرف ایسی محبت سے جذبۂ قربانی خارج سے وعظ و نصیحت کی تحریک پر کی جانے والی نیکی کے بجائے اپنی اندرونی لگن سے کیے جانے والے عمل میں بدل جائے گا۔ تبھی آپ ایمانی تقاضوں کی تکمیل پر حقیقی خوشی اور مسرت سے سرشار

ہوسکیں گے۔ یاد رکھیے کہ ایمان بھی دو قسم کا ہوتا ہے: ایک ہماری زبان پر رہتا ہے اور یہ ایسا ایمان ہے جو بوجھ بن جاتا ہے۔ ایک ایمان وہ ہے جو ہمارے دِل کی گہرائیوں میں سرایت کر جاتا ہے اور یہ وہ ایمان ہے جو خوشی، اطمینان اور لطف کا باعث بنتا ہے۔ جب یہ ایمان حاصل ہوجائے تو اگر آپ سے وقت، مال و دولت اور زندگی کی یا پسند و ناپسند اور نقطۂ نظر کی قربانی طلب کی جائے گی تو آپ یہ چیزیں بخوشی قربان کر دیں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تین چیزیں ایسی ہیں کہ جس کے پاس ہوں اُس نے ایمان کی حلاوت کا ذائقہ چکھ لیا: (اُن میں سے پہلی چیز یہ ہے کہ) وہ دُنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر اللہ اور اُس کے رسولؐ سے محبت رکھتا ہو''...... (بخاری، مسلم)

اللہ سے ایسی محبت کس طرح کی جائے کہ وہ ہر شے کی محبت سے بڑھ جائے؟ اس مقصد کے لیے کوئی جامع فارمولا ہے، نہ ہوسکتا ہے، مگر چند چیزیں کارگر ہوسکتی ہیں اور ان میں سے ہر چیز آپ کی اُن اندرونی صلاحیتوں میں اضافہ کرے گی جو قربانی کے تقاضے پورے کرنے کے لیے درکار ہیں۔

ذکر الٰہی

ہر وقت یاد رکھیے کہ اُس نے آپ کو کیسے پیدا کیا ہے، کس طرح آپ کی ضرورت کی ہر چیز آپ کو مہیا کی ہے، وہ کتنا رحیم و کریم ہے۔ اپنے وجود پر نظر ڈالیے، اپنے اردگرد کی کائنات کا مشاہدہ کیجیے، آپ کو ہر طرف اُس کی رحمت و رافت، اُس کی حکمت اور اُس کی شان و شوکت نظر آئے گی۔ جب آپ اُس کی ان نشانیوں پر غور و فکر کریں گے جو ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں تو اُس سے آپ کی محبت میں اضافہ ہوگا۔ اُس کے ذکر کا ایک جز و اُس کی طرف رجوع کرنا اور اُس سے محبت کرنے میں اُس سے مدد چاہنا بھی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس کے متعدد طریقے تعلیم فرمائے ہیں۔

جب اور جتنا ممکن ہو، اللہ کا ذکر کریں، یہ بنیادی اور لازمی عمل ہے۔ اس سے نہ صرف آپ کو اللہ کی محبت کے حصول میں مدد ملے گی، بلکہ جذبۂ قربانی بڑھانے کے لیے آپ کو جن دیگر وسائل کی ضرورت ہے وہ بھی حاصل ہوں گے، جیسے اُس کے حاضر و ناظر ہونے کا احساس، اُس سے ملاقات اور اُس کے انعامات کی قدر و قیمت کا حقیقی ادراک، اس دُنیاوی زندگی کی حقیقت اور دُنیا کی حیثیت کا فہم، اُس کے حضور شکر گزاری اور عجز و انکسار کا اظہار، اس خوف سے لرزتے رہنا کہ اُس کا حق کبھی ادا نہیں کیا جاسکتا، اُس کے احکامات کی تعمیل کے لیے آمادہ اور تیار رہنا۔

احساسِ حضوری

زندگی ایسے گزاریئے جیسے آپ اُس کے سامنے موجود ہیں۔ یاد رکھیے کہ: وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ ط (الحدید ۵۷:۴)، ''وہ تمھارے ساتھ ہے جہاں بھی تُم ہو''۔ جب آپ سے قربانی طلب کی جائے یا آپ ازخود قربانی پیش کریں، یہ بات ہمیشہ یاد رکھیں کہ آپ اُس کی نظروں کے سامنے ہیں۔ یہی بات وہ آپ سے ہروقت ذہن میں رکھنے کے لیے کہتا ہے: فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا (الطور ۵۲:۴۸)، ''یقیناً تُم ہماری نظروں میں ہو''۔ جب آپ اس یقینِ کامل کے ساتھ کوئی قربانی پیش کریں گے کہ جسے پیش کررہے ہیں وہ آپ کو دیکھ رہا ہے اور اُس کا دیا ہوا اجر کئی گُنا زیادہ اور ابدی ہوگا، تو یہ آپ کے اندر وہ قوتِ محرکہ اور توانائی پیدا کردے گا جو آپ کو درکار ہے۔

یہ احساسِ حضوری کہ ہم اُس کے سامنے موجود ہیں، اُس کی نظریں ہم پر ہیں، وہ ہماری باتیں سُن رہا ہے، جب ہم اپنے فرائض سرانجام دے رہے ہیں تو مالک ہماری نگرانی کررہا ہے اور بڑی سخاوت اور مہربانی کے ساتھ ہمیں اجروثواب سے نواز رہا ہے___ یہ احساس جذبۂ قربانی کو اُبھارنے کا اوّلین ذریعہ ہے۔ اس سے اللہ پر بھروسا بھی پیدا ہوتا ہے۔ جب آپ کو یہ احساس ہوجائے کہ وہ ہروقت آپ کے ساتھ ہے تو آپ اپنے تمام معاملات اُسی کے سامنے پیش کریں گے۔

شوقِ ملاقات

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ط (اٰل عمران ۳:۱۸۵) ''آخرکار ہر شخص کو مرنا ہے۔'' موت ہر شے کا اختتام نہیں ہے، اگلے مرحلے سے قبل کا وقفہ ہے۔ اُس مرحلے میں ہم اللہ کے رُوبرو کھڑے ہوں گے۔

ہم میں سے کوئی شخص مرنا پسند نہیں کرتا، یہ انسانی فطرت ہے، مگر ہمیں مرنا ضرور ہے، اور موت کے بعد ہی ہم پر ابدی زندگی اور اُس کی برکتوں کے دروازے کھلیں گے۔ اگر آپ اس دُنیاوی زندگی کی حیثیت اور حقیقت کو سمجھتے ہیں اور آپ یہ جانتے ہیں کہ آپ کو اپنا بہترین اجر اللہ سے ملاقات پر ملے گا تو آپ کے اندر دو قسم کے احساسات فروغ پائیں گے: ایک، اللہ سے ملاقات کا شوق، تاہم اپنے اعمال کی کوتاہیوں کے سبب ایک خوف بھی دِل میں جاگزیں ہوگا۔ دوسرے، اِس دُنیا کی ہر چیز اللہ کی راہ میں قربان کردینے پر آمادگی کا جذبہ جس کا اجر آپ کو آخرت میں ملے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ایک دُعا مانگا کرتے تھے: ''اے اللہ! مجھے اپنے وجہِ کریم کی زیارت کی لذت سے اور اپنی ملاقات کی تمنا سے بہرہ مند فرما''۔(نسائی، احمد، حاکم)

شکر گزاری اور عجز

قربانی کی نوعیت خواہ کچھ بھی ہو، بڑی ہو یا چھوٹی، مادّی ہو یا غیر مادّی اسے ممنونیت اور عاجزی کے ساتھ پیش کیجیے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ اللہ کی راہ میں دینے سے اپنے آپ کو مضمحل اور درماندہ محسوس کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر کہنے لگتے ہیں کہ: ''ہم تو پہلے ہی بہت وقت دے چکے ہیں، ہم پہلے ہی بہت مال دے چکے ہیں، اب ہم اور کتنا دیں؟ ہم پہلے ہی بہت قربانی دے چکے ہیں، اب ہم سے مزید کیا چاہیے؟ ایسا صرف اُسی صورت میں ہوتا ہے جب قربانی صرف ایک اللہ کی رضا وخوش نودی کے حصول کے لیے نہ دی جارہی ہو، بلکہ کسی اور جذبے کے تحت دی جارہی ہو، یا جب آپ کو اس حقیقت کا احساس نہ ہو کہ اگر کچھ قربانی دینے کا موقع مل رہا ہے تو صرف اُس کے فضل وکرم سے مل رہا ہے۔ ہر قربانی عاجزی اور انکسار کے ساتھ پیش کیجیے۔

یہ بات صاف طور پر سمجھ لینی چاہیے کہ آپ جو چیز پیش کر رہے ہیں وہ کسی فرد یا کسی تنظیم کو نہیں پیش کر رہے ہیں۔ نہ وہ چیز آپ اللہ کو ہدیہ کر رہے ہیں، کیوں کہ وہ اتنا رحیم وکریم اور فیاض ہے کہ آپ سے کہتا ہے کہ جو کچھ تُم اللہ کی راہ میں دیتے ہو وہ قرض ہے، جس کا کئی گُنا وہ تم کو لوٹادے گا۔ دراصل آپ ہر چیز اپنے آپ ہی کو دے رہے ہوتے ہیں۔ کیا کوئی شخص اپنے آپ ہی کو مزید اور مزید دیتے رہنے سے تھک سکتا ہے؟

یہ خود غرضی نہیں ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ ہماری اُخروی خوش حالی اللہ کے آگے سر جھکانے میں مضمر ہے۔ قربانی کے ذریعے سے ہم اِس دُنیا کی زندگی میں بھی بہتری لانا چاہتے ہیں اور ہمیں آخرت میں بھی ایک کامیاب وکامران ابدی زندگی کی تمنا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہر وہ قربانی جو ہم دیتے ہیں اور ہر وہ چیز جو ہم اللہ کی راہ میں قربان کرتے ہیں، ہماری قوم کو مزید تقویت فراہم کرتی ہے۔ لہٰذا اللہ کا شکر ادا کیجیے کہ اُس نے آپ کو قربانی دینے کا موقع دیا، آپ کو اپنے کام کے لیے طلب کیا، اور اپنی راہ میں قربانی دینے کی توفیق سے نوازا۔ اس کے برعکس بھی ہوسکتا ہے۔ ہم بھٹکتے پھرنے کے لیے چھوڑ دیے جائیں۔ ہمیں مال کی

قربانی دینے کا موقع ہی نہ ملے، یوں ہم ابدی انعامات کے حصول سے محروم رہ جائیں۔ آپ کو ہر قربانی جذبۂ تشکر اور احساسِ ممنونیت کے ساتھ دینی چاہیے۔ اُس کی طرف قبولیت کی آس کے ساتھ دیکھنا چاہیے۔

عجز وانکسار بھی ضروری ہے۔ کبھی یہ احساس پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ بہت ہوگیا۔ جوں ہی اس بیماری کے جراثیم آپ کے دل میں داخل ہوں گے کہ آپ نے بہت کچھ کرلیا ہے، سب کچھ ضائع ہوجائے گا۔ ہمیشہ یہ خیال رہنا چاہیے کہ آپ جو کچھ قربان کر رہے ہیں، وہ اللہ کی طرف سے عائد ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کافی نہیں ہے۔ یہ خیال رہنا کہ جتنی بھی قربانی دی جائے وہ کبھی کافی نہیں ہوگی، قربانی کی بنیاد ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے: وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُھُمْ وَجِلَۃٌ (المومنون ۲۳:۶۰)، ''وہ دیتے ہیں جو کچھ بھی دیتے ہیں، مگر اُن کے دل لرزتے رہتے ہیں''۔

اندرونی قوتِ محرکہ

وہ بنیادی قوتِ محرکہ جو آپ کو قربانی دینے پر آمادہ کرے خود آپ کے اندر موجود رہنی چاہیے۔ یہ اُمنگ اندر سے اُٹھنی چاہیے۔ اس کی جڑیں آپ کے قلب وروح کی گہرائیوں میں پیوست ہونی چاہییں۔ نہ گروہی فیصلہ، نہ دیکھا دیکھی، نہ تنظیمی پابندی، نہ کوئی اور خارجی دباؤ آپ کو قربانی کے لیے آگے بڑھنے کے لیے اُکسائے۔ ان میں سے ہر چیز اہم ہے اور ہمارے رویّوں کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ لیکن اگر اللہ کی رضا کے سوا کسی اور مقصد سے قربانی پیش کی جائے تو بڑے پیمانے پر قربانی دینا، یا مسلسل قربانی دیے جانا، ہر قسم کے حالات میں انتہائی مشکل ہوجاتا ہے۔ قربانی کے لیے عزم وارادہ اور جذبہ اندر سے اُبھرنا چاہیے۔

برضا و رغبت فیصلہ

قربانی دینے کا فیصلہ برضا و رغبت کرنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو خود اپنے فیصلے کے تحت، آپ کے پاس جو کچھ بھی موجود ہے اُس کی قربانی، اللہ کی رضا کی خاطر پیش کرنے کے لیے آگے بڑھنا چاہیے۔ آپ کو راضی برضاے الٰہی ہوجانا چاہیے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قربانی پیش کرتے ہوئے کسی کو زحمت اور تکلیف کا احساس بھی نہیں ہونا چاہیے۔ جس وقت آپ اپنی محبت، اپنی پسند یا اپنی قابلِ قدر چیز سے دست بردار ہو رہے ہوتے ہیں، تو تکلیف محسوس ہونا بشری تقاضا ہے۔ یقینی بات ہے کہ اگر آپ کوئی شے قربان کرتے ہوئے تکلیف نہ محسوس کریں تو وہ قربانی کہے جانے کی مستحق ہی نہیں ہے۔ آپ اپنے گھر سے محض وہ چیز پھینک رہے ہیں جو آپ کے لیے بے کار ہے۔ اس کے بجاے آپ کو جس قدر زیادہ دُکھ ہو رہا ہوگا وہ اُتنی ہی قیمتی قربانی ہوگی۔ مگر اس تکلیف اور دُکھ کی پشت پر آپ کا عہدِ وفا ہے۔ وہ عہد جو آپ کو اپنی قیمتی چیز اللہ کی رضا کے حصول کے لیے قربان کر دینے کا ہے۔ اللہ کی رضا حقیقتاً سب سے بڑھ کر قیمتی چیز ہے۔ آپ یہ تکلیف اور دُکھ اللہ سے اپنی محبت کی وجہ سے برضا و رغبت برداشت کرتے ہیں، کیوں کہ آپ کے دل میں اللہ کی محبت ہر چیز کی محبت سے بڑھ کر ہے۔

دو استعانتیں

ہماری مدد و معاونت کے لیے دو بنیادی چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو ہماری اندرونی صلاحیتوں میں اضافہ کرتی ہیں، میں ان کو آپ کے سامنے پہلے ہی رکھ چکا ہوں۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ (البقرہ ۲:۱۵۳)، اے لوگو جو ایمان لائے ہو، صبر اور نماز سے مدد لو۔

نماز کیا ہے؟ یقیناً نماز ایک رسمی عبادت ہے۔ چند جسمانی حرکات و سکنات پر مشتمل ہے۔ اس میں کچھ الفاظ بھی شامل ہیں جو ہم ابتدا سے آخر تک پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن نماز کا مجموعی مقصد اللہ کا ذکر کرنا اور اللہ کو یاد رکھنا ہے۔ یہی بات قرآن صاف اور واضح الفاظ میں کہتا ہے: وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (طٰہٰ ۲۰:۱۴)، ''میری یاد کے لیے نماز قائم کرو''۔

صبر جامع المعانی لفظ ہے۔ لغوی طور پر صبر کے معنی ہیں: رُک جانا اور باز رہنا۔ قرآن میں یہ لفظ وسیع مفاہیم میں استعمال ہوا ہے اور کئی صفات کا احاطہ کرتا ہے: اپنے آپ کو روکے رکھنا، ارادہ کرنا، تحمل اور جذبۂ قربانی، نظم و ضبط اور ثابت قدمی۔ یہ آپ کو اللہ سے، اپنے کیے ہوئے عہد سے اپنے بھائیوں سے اور آپ کو اپنی اُخروی فلاح سے جوڑے رکھتا ہے۔ نماز اور صبر کا دامن تھامے رکھنے سے آپ کو وہ استقامت حاصل ہوگی جو قربانی کے لیے ضروری ہے۔

دو مثالی پیکر

آخر میں ہمیں قربانی کے دو مثالی پیکروں پر نظر ڈالنی چاہیے۔

اُن میں سے ایک ہیں سیدنا ابراہیم علیہ السلام۔ اُن کو ہر قابل تصور طریقے سے آزمایش میں مبتلا کر کے جانچا گیا۔ اُن کے والد، اُن کا خاندان، اُن کے زمانے کی مذہبی اور سیاسی طاقتیں، سب اُن کے مخالف تھے۔ اُنھوں نے سب کو چھوڑ دیا۔ اُنھیں آگ کے الاؤ میں پھینک دیا گیا۔ اُن کو گھر سے نکال دیا گیا۔ اُنھیں صحراؤں اور جنگلوں میں بھٹکنا پڑا اور آخرکار اُنھوں نے اپنے بیٹے کے گلے پر چھری رکھ دی۔ یہی کام غالباً دشوار ترین کام تھا۔ وہ نہ صرف اپنے پیارے بیٹے کی قربانی دے رہے تھے بلکہ تسلیم شدہ انسانی اخلاق کی بھی قربانی دے رہے تھے۔ تاہم، حتمی بات یہ ہے کہ تمام اخلاقیات اللہ کی مرضی کی تابع ہیں۔ اُس کو راضی رکھنا سب سے بڑا اخلاقی پیمانہ ہے۔ یقیناً یہ صرف اللہ کے نبی کا منصب ہے کہ وہ اُس کے براہِ راست حکم پر اللہ کے متعین کردہ اخلاق سے ماورا یہ انتہائی قربانی اُس کے حضور پیش کردے۔ تاہم، بعض مواقع پر ہم میں سے بعض کو بھی اللہ کے واضح احکام کے مقابلے میں اپنے ذاتی اخلاقی فیصلوں کو معطل کرنا پڑتا ہے۔ ان قربانیوں اور آخری قربانی کو پیش کرنے کے بعد ہی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو 'امام الناس' بنانے کا اعلان کیا گیا:

> وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰھٖمَ رَبُّهٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّھُنَّ ط قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ط (البقرہ ۲:۱۲۴)، یاد کرو جب ابراہیمؑ کو اُس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ اُن سب پر پورا اُتر گیا، تو اُس نے (اللہ نے) کہا: میں تجھے سب انسانوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔

اگر ہم یہ کہتے اور دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اسلام کی نشاَتِ ثانیہ کے لیے اُٹھے ہیں، جہاں اسلام بنی نوع انسان کا رہبر و قائد ہوگا تو ہمیں انفرادی اور اجتماعی طور پر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے اُسوۂ مبارکہ کی پیروی اور تقلید کرنی چاہیے۔

دوسرا نمونہ سیدنا ونبینا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ خواہ وہ وادیِ مکہ ہو، جہاں آپؐ کی راہ میں کانٹے بچھائے گئے، یا وادیِ طائف ہو، جہاں آپؐ پر سنگ باری کی گئی، یا اُحد کا میدان ہو، جس میں آپؐ کے دندان مبارک شہید کردیے گئے، یا مدینے کی گلیاں ہوں، جن میں آپؐ کے دشمنوں نے

آپؐ کے خلاف افترا پردازانہ پروپیگنڈا کیا، آپؐ نے ہمارے لیے قربانی کی افضل ترین مثالیں چھوڑی ہیں۔ ایسا ہی آپؐ کے صحابہ کرامؓ نے بھی کیا۔

بنیادی اُصول

جیسا کہ ہم پہلے جائزہ لے چکے ہیں، بنیادی طور پر قربانی کا مطلب جانور کا ذبح کرنا ہے۔ حج کے دوسرے دن سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی قربانیوں کی یاد تازہ کرنے کے لیے جانور قربان کیے جاتے ہیں۔ حج خود ایک رسمِ عبودیت ہے جس میں انتہائی سخت مشقت بھری قربانیاں شامل ہیں۔ یہاں ہمیں دو اہم اسباق ذہن نشین کر لینے چاہییں:

اوّل: اللہ کے یہاں قبولیت ہماری قربانی کے جانور کی نہیں ہوتی، بلکہ قبولیت ہمارے دلوں میں پائی جانے والی اللہ سے محبت کی، ہماری اطاعت کی اور ہماری قربانی دینے کی نیت کی ہوتی ہے۔ اس بنیادی اُصول کو کبھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیجیے، روح کو چھوڑ کر صرف رسم پر مطمئن نہ ہوجایئے، البتہ رسم کو بھی ترک نہ کیجیے: لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ (الحج ۲۲:۳۷)، نہ اُن کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں نہ خون، مگر اُسے تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

دوم: اعلیٰ ترین قربانی زندگی کی قربانی ہے۔ اللہ کی راہ میں اپنی حیاتِ دُنیوی کی قربانی دے کر آپ صرف ایک بار موت کو گلے لگاتے ہیں اور یہ آخری قربانی ہے۔ مگر آپ اُس صورت میں ہر روز اور ہر لمحے موت کو گلے لگاتے ہیں جب آپ دل کی گہرائیوں میں پیوست محبت کے ہاتھوں مجبُور ہوجاتے ہیں اور اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ کے حوالے کر دیتے ہیں، اور تمام اندرونی اور بیرونی مخالفتوں کے باوجود اُس کی اطاعت وفرماں برداری کرتے رہتے ہیں۔ یوں آپ اپنی زندگی کی قربانی ایک بار نہیں دیتے، بار بار دیتے رہتے ہیں۔ یہ افضل ترین قربانی ہے: قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝ (الانعام ۶:۱۶۲) کہو، میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔

حاصلِ کلام

آخر میں مجھے یہ کہنے دیجیے کہ ہم سے یہ تمام قربانیاں اس لیے طلب کی جاتی ہیں کہ ہم نے

اپنے کاندھوں پر اُس مشن کی تکمیل کا بوجھ اُٹھا رکھا ہے جو اللہ کے رسولوں کو سونپا گیا تھا: 'تاکہ تم لوگوں کے سامنے گواہ بن کر کھڑے ہو'۔ ہمیں اپنے رب کا سچا بندہ بننا چاہیے اور انسانیت کا بے لوث خادم۔ بنی نوع انسان ہی کے لیے ہمیں ایک اُمت کی حیثیت سے مبعوث کیا گیا ہے۔ اس بعثت کا تقاضا ہے کہ ہم زندگی کے ایک مشکل ترین کام کے لیے اپنے آپ کو تیار کرلیں۔

قربانی کے بغیر اسلام کی نشاَتِ ثانیہ کا کام ہمیشہ صرف تقریروں کا یا خواب کا موضوع بنا رہے گا۔ اس خواب کو حقیقت بنانے کے لیے ہمیں اپنا وقت، اپنا مال، اپنی زندگی، اپنے وسائل اور اپنی ذاتی پسند و ناپسند کی قربانی دینی ہوگی۔ تاہم ہماری بہترین کوششیں بھی کاملیت کے درجے کو نہیں پہنچ سکتیں۔ ہم ڈگمگا سکتے ہیں، ڈانوا ڈول ہوسکتے ہیں اور مایوسی کا شکار ہوسکتے ہیں۔ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ اللہ صرف ہماری نیتوں اور کوششوں کو دیکھتا ہے۔ ہمیں اللہ سے رجوع کرنا چاہیے اور اُس سے مدد مانگنی چاہیے، مبادا کہ جس وقت ہم سے قربانی طلب کی جائے اُس وقت ہماری بشری کمزوریاں ہم پر غالب آجائیں۔ ہمیں اپنی کوتاہیوں اور خطاؤں پر اُس سے مغفرت طلب کرنی چاہیے:

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ج رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ج وَاعْفُ عَنَّا وقفة وَاغْفِرْ لَنَا وقفة وَارْحَمْنَا وقفة اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ○ (البقرہ ۲:۲۸۶)، اے ہمارے رب! ہم سے بھول چوک میں جو قصور ہوجائیں، اُن پر گرفت نہ کر۔ مالک! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے۔ پروردگار! جس بار کو اُٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے، وہ ہم پر نہ رکھ۔ ہمارے ساتھ نرمی کر، ہم سے درگزر فرما، ہم پر رحم کر، تو ہمارا مولیٰ ہے، کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔

جولائی ۱۹۷۹ء میں لاس اینجلس (امریکا) میں مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کی 'مغربی ساحل کانفرنس' (West Coast Conference) میں نمازِ جمعہ کے موقع پر خرم مرادؒ کا خطاب جو Sacrifice کے عنوان سے شائع ہوا۔ ترجمہ: احمد حاطب صدیقی

(کتابچہ منشورات سے دستیاب ہے۔ قیمت: ۲۵ روپے۔ زیادہ تعداد میں لینے پر رعایت)

یا حیُّ　　　　بسم اللہ الرحمٰن الرحیم　　　　یا قیُّوم

لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰٓی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰٓی اٰلِ
اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ o اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا
بَارَکْتَ عَلٰٓی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰٓی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ o

سیرت نبوی ﷺ پر عمل کی نیت سے ڈاکٹر عبدالحی عارفی ؒ کی تالیف ''اسوۂ رسول اکرم ﷺ'' کا مطالعہ بہت مفید ہے۔

حضور ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور کی یاد تازہ کرنے کے لیے بڑی مفید کتاب ''ہمارا اسلام قبول کرنا''

رابطہ کے لیے منشورات منصورہ لاہور فون: 042-35434909

نیک بنو
نیکی پھیلاؤ

خصوصی گزارش: مکۃ المکرمہ اور مدینۃ المنورہ جانے والے حضرات سے حرم کعبہ اور روضۂ رسول ﷺ پر حاضری کے وقت خصوصی دعا اور سلام پیش کرنے کی درخواست ہے

Please visit www.addawa.com

فقہی رخصتوں پر عمل

وسیع المشربی یا بے دینی؟

ذکی الرحمان غازی*

استفتا یا اہلِ علم سے زندگی کی پیچیدگیوں کے بارے میں شرعی رہنمائی طلب کرنا اسلامی معاشرتی زندگی کا لازمہ ہے۔اسی اہمیّت کے پیشِ نظر متعدد عظیم المرتبت ائمہ کرام کی استفتا کے موضوع پر مستقل تصنیفات ملتی ہیں، جن سے فتوے کی اہمیّت، ضابطے اور آداب کی وضاحت ہوتی ہے، نیز سائل اور مفتی، ہردو کے فرائضِ منصبی اور ذمہ داریوں اور ان سے متعلقہ احکامات کو بھی پوری شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ۔آج اگر اس موضوع کے حوالے سے مسلم معاشرے کے رویے کا تجزیہ کیا جائے ،تو یہ بات واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہے کہ افتا و استفتا کے بارے میں ہمارا طرزِ عمل بڑی حد تک شریعتِ حنیفہ کی تعلیمات سے منحرف اور ائمہ عظام کے مقرر کردہ اصولوں سے دُور ہو گیا ہے۔

آج افتا کے متعلّق ہمارے اندر احساسِ ذمہ داری کا فقدان، جلد بازی، بلا اثبات و مراجعہ ناپختہ رائے کا اظہار، باوجود نااہلی اور غیر مستند ہونے کے فتویٰ دینے کی جسارت، اس میں سہولت کوشی اور مستفتی [سائل] کی خواہشِ نفس کی مطابقت کا اہتمام کرنے جیسی کوتاہیاں پائی جاتی ہیں۔ مذکورہ بالا جملہ اُمور میں سے ہر ایک کے کچھ اسباب ہوتے ہیں جن کی تفصیل بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں۔ ان تمام امور میں سب سے زیادہ پُرخطر اور پُرفتن مسئلہ فتوے میں سہولت کوشی و تن آسانی کو مدنظر رکھنا ہے۔ فتوے میں حدِ اعتدال سے بڑھتا ہوا سہولت پسندی کا یہ رجحان ایک طرح سے فقہی رخصتوں پر عمل کا

قوی محرک بنتا ہے، جو ایک بے حد خطرناک رجحان ہے۔ ہمارے زمانے میں اس بیماری نے ایک قسم کے فیشن کی صورت اختیار کر لی ہے، جس کے نتیجے میں عالمِ اسلام میں خودساختہ آرا و فتاویٰ کا ایک خودرو جنگل وجود میں آ گیا ہے اور صنعتی اشیاے خورونوش کی طرح ہر نیا دن کچھ سرپھرے افکار کو جنم دیتا جاتا ہے۔ اس مضمون میں اسی حساس مسئلے کے کچھ پہلوؤں کے متعلق بحث کی گئی ہے۔ وباللّٰہ التوفیق

شرعی رخصت کا مفہوم

عربی زبان میں رخصت کے لغوی معنیٰ تسہیل، تخفیف، تیسیر اور عدمِ تشدید کے آتے ہیں۔ (مقاییس اللغة، ابن فارس، ج۲،ص ۵۰۰۔ لسان العرب، ابن منظور، ج۷،ص۴۰)۔ شرعی رخصت کے اصطلاحی معنیٰ ہیں: ''وہ حکمِ شرعی جو صعوبت سے سہولت کی طرف منتقل ہوا ہو اور جس میں کسی عذر کے باعث آسانی پیدا کر دی گئی ہو۔ اگرچہ اصلی حکم کا سبب جوں کا توں اپنی جگہ قائم ہو''۔ (رفع الحاجب عن مختصر ابن الحاجب، تاج الدین سبکی، ج۲،ص۲۶۔ مذکرة فی اصول الفقہ، محمد الامین شنقیطی، ص۶۰)

شرعی رخصت کے عام مفہوم میں یہ بات شامل ہے کہ ان گنجایشوں کی مشروعیت سے شارعِ حکیم کے پیشِ نظر یہ ہے کہ مکلفین پر تخفیف ہو اور احکامِ شریعت میں سہولت کا پہلو نمایاں رکھا جائے تاکہ ان پر عمل کا داعیہ باقی رہے اور بندگانِ خدا کی زندگی مشقت سے محفوظ رہ سکے۔ مثال کے طور پر جو شخص کسی وجہ سے پانی کے استعمال پر قادر نہ ہو، یا پانی ناپید ہو گیا ہو، تو ایسی صورت میں تیمّم کرنا جائز ہے۔ ارشادِ باری ہے:

وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝ (النساء ۴:۴۳) اور اگر کبھی ایسا ہو کہ تم بیمار ہو، یا سفر میں ہو، یا تم میں سے کوئی شخص رفعِ حاجت کر کے آئے، یا تم نے عورتوں سے لمس کیا ہو، اور پھر پانی نہ ملے تو پاک مٹّی سے کام لو اور اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کر لو، بے شک اللہ نرمی سے کام لینے والا اور بخشش فرمانے والا ہے۔

اسی طرح قرآن کریم میں نصِ جلی کے ساتھ مردار کھانے کی حرمت وارد ہوئی ہے، لیکن آگے چل کر حالتِ اضطرار میں اس کے استعمال کی رخصت بھی دی گئی ہے۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے:

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَ الدَّمُ وَ لَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَ مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَ الْمَوْقُوْذَةُ وَ الْمُتَرَدِّيَةُ وَ النَّطِيْحَةُ وَ مَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ قف وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَ اَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ط ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ط اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِ ط اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ط فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ o (المائدہ ۵:۳) تم پر حرام کیا گیا ہے مردار، خون، سُور کا گوشت، وہ جانور جو خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، وہ جو گلا گھٹ کر، یا چوٹ کھا کر، یا بلندی سے گر کر، یا ٹکر کھا کر مرا ہو، یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو، سوائے اس کے جسے تم نے زندہ پاکر ذبح کرلیا اور وہ جو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا ہو۔ نیز یہ بھی تمھارے لیے ناجائز ہے کہ پانسوں کے ذریعے سے اپنی قسمت معلوم کرو۔ یہ سب افعال فسق ہیں۔ آج کافروں کو تمھارے دین کی طرف سے پوری مایوسی ہو چکی ہے، لہٰذا تم اُن سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمھارے لیے اسلام کو تمھارے دین کی حیثیت سے قبول کرلیا ہے (لہٰذا حرام وحلال کی جو قیود تم پر عائد کی گئی ہیں اُن کی پابندی کرو)۔ البتہ جو شخص بھوک سے مجبور ہو کر اُن میں سے کوئی چیز کھالے، بغیر اس کے کہ گناہ کی طرف اس کا میلان ہو تو بے شک اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

مذکورہ بالا دونوں مثالوں جیسی بے شمار مثالیں ہیں جو اسلامی شریعت میں رخصتوں کے ضمن میں آتی ہیں۔ بندگانِ خدا کے لیے سہولتوں کی فراہمی کا اہتمام اور رخصتوں کی مشروعیت ایک ایسا اسلامی اصول ہے جس کی تائید قرآن وسنت کی لاتعداد نصوص کی واضح دلالت سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ

۲:۱۸۵) ''اللہ تمھارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے، سختی کرنا نہیں چاہتا''۔ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ط (الحج ۲۲:۷۸) ''اس نے تمھیں اپنے کام کے لیے چُن لیا ہے، اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی''۔ اللہ کے سچے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''تم لوگ اللہ کی عطا کردہ رخصتوں پر عمل پیرا ہونے کو لازم پکڑو''۔ [عليكم برخصة اللّٰه الّذي رخص لكم] (مسلم، حدیث ۱۱۱۵، سنن نسائی، حدیث ۲۲۵۸، مع تصحیح البانی)

قرآن وسنت میں وارد اس قسم کی آیات واحادیث کی روشنی میں علمائے دین نے ایسے متعدد شرعی قواعد کا استنباط کیا ہے جو اسلام کی کشادگی اور عدل پروری کی جیتی جاگتی دلیل ہیں۔ متعدد اہلِ علم نے ان شرعی قاعدوں کو مختلف تاریخی ادوار میں مستقل تصانیف کا موضوع بنایا ہے۔ زیربحث موضوع سے تعلّق رکھنے والے چند شرعی قواعد یہ ہیں:

- المشقة تجلب التيسير، مشقت کا وجود آسانی لاتا ہے۔
- الحرج مرفوع، حرج کا ازالہ ضروری ہے۔
- لا ضرر ولا ضرار، نہ نقصان اٹھایا جائے نہ کسی کو پہنچایا جائے۔
- الضرر يُزال، متعدی ضرر کا ازالہ کیا جائے گا۔
- اذا ضاق الأمر اتّسع، جب معاملہ تنگ ہوجائے تو اس میں وسعت آجاتی ہے۔

مذکورہ بالا آیات، احادیث اور معتبر شرعی قواعد سے ایک طرف جہاں اسلامی شریعت کے عمومی مزاج کا پتا چلتا ہے، وہیں ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ معاملاتِ زندگی میں مشقتوں پر سہولتوں کی ترجیح اور رخصتوں کی فراہمی کا پہلو کسی بھی انسانی نظامِ حیات کے لیے ناگزیر ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دینِ فطرت اسلام نے اس پہلو کی کماحقہ رعایت کی ہے۔ (رفع الحرج فی الشریعة الاسلامیة، ضوابطه وتطبیقاته، ڈاکٹر صالح بن حمید، ص ۹۳، الدُرر البهیّة فی الرخص الشرعیّة، ڈاکٹر اسامة الصلابی، ص ۶۰)

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ان شرعی رخصتوں سے مستلزم کچھ احکام، شرائط اور ضابطے بھی ہوتے ہیں، جن پر علمائے اصولِ فقہ نے اپنی کتابوں میں مستقل ابواب کے تحت سیرحاصل گفتگو فرمائی ہے۔ یہاں شرعی رخصتوں کے مفہوم اور ان کی وضاحت کے لیے مثالیں اس

لیے بیان کی گئی ہیں تاکہ قارئین کی نظر میں زیرِ نظر مضمون کے موضوع سے ان کا کسی قسم کا التباس باقی نہ رہے۔ ہمارا موضوع فقہاے دین کی رخصتوں کا اتباع اور اس کی شرعی حیثیت ہے، اس پر تفصیلی کلام آگے آئے گا۔اس کے برعکس شرعی رخصتوں پر عمل کرنے میں کسی قسم کی قباحت نہیں ہوتی ،بشرطیکہ تمام لوازمات پائے جائیں اور کوئی شرعی عذر مانع نہ ہو۔اس مضمون کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ اختلافی مسائل میں فقہاے اسلام کے مختلف اقوال میں تلاشِ بسیار کے بعد آسان ترین قول کو اختیار کرنا، بذاتِ خود کس حد تک جائز ہے؟

اتباع کی تعریف

رخصت ہاے فقہیہ کی پیروی یا اتبّاع کی اہلِ علم نے متعدد تعریفیں کی ہیں۔ اگرچہ ان تعریفوں کا منشا و مفہوم ایک ہے لیکن ان میں سے بعض تعریفیں بڑی دقیق ہیں۔علامہ بدرالدین زرکشیؒ کے نزدیک اتباع کی تعریف یہ ہے کہ انسان ہر فقہی مسلک سے اپنے لیے آسان جزیہ کو اختیار کرے (البحرالمحیط، ج ۶، ص ۳۲۵)۔جلال محلیؒ کے نزدیک تتبع یہ ہے کہ انسان اپنے پیش آمدہ مسائل میں ہر مسلک سے وہ لے جو اس کے لیے آسان ہو۔(شرح المحلی علی جمع الجوامع، ج ۲، ص ۴۰۰) عصرِ حاضر میں بین الاقوامی اسلامی فقہی فورم (جدہ، سعودی عرب) نے اس کی جو تعریف اختیار کی ہے وہ یہ ہے کہ: انسان جان بوجھ کر ان مسلکی اجتہادات کو اختیار کرے جو کسی امر کو جائز قرار دیں، حالانکہ ان کے مقابلے میں اس امر کی ممانعت کے اجتہادات بھی پائے جاتے ہوں (قرارات و توصیات مجمع الفقہ الاسلامی الدولی، ۱۵۹-۱۶۰، قرار رقم: ۷۰)۔ گذشتہ جملہ تعریفوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اتباع کا مطلب ہے کہ انسان دینی مسائل میں علماے کرام کا وہ قول اختیار کرے جو اس کے لیے سہولت کا حامل ہو، بایں طور کہ اس کا یہ بین المسلکی اتباع کسی دلیل کی قوت وفہم کی وجہ سے نہ ہو، بلکہ اس کا محرک خواہشاتِ نفس کی پیروی، شہوت پرستی یا شریعت سے ناواقفیت یا اعراض ہو۔

تلفیق کا مسئلہ

اتباع سے ملتا جلتا لیکن اس سے بے حد مختلف ایک مسئلہ تلفیق کا ہے۔ تلفیق کا مطلب ہے

کہ کسی ایک دینی مسئلے میں دو یا دو سے زیادہ فقہی اقوال کو اس طرح جوڑ کر دیکھا جائے کہ اس سے ایک ایسا تیسرا قول پیدا ہو جائے جس کو کسی مجتہد نے کبھی اختیار نہ کیا ہو۔ (عمدۃ التحقیق فی التقلید و التلفیق، محمد سعید البانی، ص ۹۱) بیش تر علماے کرام کے نزدیک تلفیق سرے سے ممنوع ہے، جب کہ بعض دیگر فقہا نے اس کو مشروط جائز رکھا ہے۔ جائز رکھنے والے فقہا میں نمایاں نام علامہ شہاب الدینؒ مالکی قرافی، علامہ ابن تیمیہؒ، علامہ ابن القیمؒ اور عبد الرحمٰن معلّمیؒ کے آتے ہیں۔ (التلفیق فی الاجتہاد والتقلید، ڈاکٹر ناصر المیمان، ص ۱۸۱)۔ موجودہ زمانے میں بین الاقوامی اسلامی فقہی فورم (جدہ، سعودی عرب) نے بھی اسی موقف کو اختیار کیا ہے۔ ذیل میں ان کی تجویز کردہ شرائط کا خلاصہ نقل کیا جاتا ہے:

۱- تلفیق کے نتیجے میں کسی ممنوع وحرام چیز کا جواز برآمد نہ ہوتا ہو۔

۲- تلفیق کی رو سے مسلمان حاکمِ وقت کا کوئی فیصلہ مسترد نہ ہوتا ہو۔

۳- تلفیق سے کسی معمول بہ تقلیدی حکم کا ابطال نہ ہوتا ہو۔

۴- اجماع یا اس کے لوازمات متأثر نہ ہوتے ہوں۔

۵- کوئی ایسا حکم یا حالت ترکیب نہ پاتی ہو جس پر کبھی کسی مجتہد کا عمل نہیں رہا۔

ان شرائط میں سے ہر شرط کے ضمن میں چند مثالیں بھی دی جاسکتی ہیں، لیکن سرِ دست یہاں ہم صرف تلفیق اور تتبع کے مابین فرق بتانے پر اکتفا کریں گے:

۱- تتبع کے ذریعے سے اختلافی مسائل میں اسہل وخفیف قول پر عمل درآمد ہوتا ہے، جب کہ تلفیق کے ذریعے کسی ایک مسئلے میں دو یا دو سے زیادہ اقوال کو جمع کر کے ان سے کسی شرعی حکم کا استنباط کیا جاتا ہے۔

۲- تلفیق کے ذریعے فقہا کے اقوال میں تصرف کر کے ایسا حکم نکالا جاسکتا ہے جو کسی مجتہد نے کبھی مستنبط نہ کیا ہو، جب کہ تتبع میں صرف موجودہ اقوال کے دائرے میں رہتے ہوئے ہی اپنا مطلوب حاصل کیا جاتا ہے۔

۳- تلفیق کا عمل بسا اوقات اجماع کی مخالفت کا سبب بن جاتا ہے، جب کہ تتبع میں نقضِ اجماع کا امکان نہیں ہوتا۔

اخذِ رخصت کا حکم

اس عنوان کے تحت دو مسئلے آتے ہیں، شرعی رخصت کے اخذ کا حکم اور اتباع کا حکم۔ ہم سلسلہ وار ان پر گفتگو کریں گے:

● **شرعی رخصت کے اخذ کا حکم:** جمہور اہلِ علم کے نزدیک شرعی رخصتوں سے استفادے میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ ان کے اسباب و دواعی کو مدِ نظر رکھا جائے۔ شرعی رخصت کی کئی اقسام ہیں:

۱- واجب رخصت، مثلاً حالتِ اضطرار میں مردار کا کھانا۔ چونکہ انسانی جان بچانا واجب ہے اس لیے یہ رخصت بھی واجب ہوگی۔

۲- مستحب رخصت، مثلاً حالتِ سفر میں نمازیں قصر کرنا، جب کہ تمام شرطیں پائی جائیں اور کوئی مانع بھی نہ ہو۔

۳- مباح رخصت، مثلاً شدید اکراہ کی حالت میں قلبی ایمان رکھتے ہوئے کلمۂ کفر بول دینا۔

۴- خلافِ اولیٰ رخصت، مثلاً ماہِ رمضان میں کوئی ایسا مسافر روزہ نہ رکھے جس کے بارے میں یقین ہو کہ حالتِ سفر میں روزہ رکھنے سے وہ تکلیف میں مبتلا نہیں ہوگا۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں: شرح الكوكب المنير، ابن النجار، الدرر البهية فی الرخص الشرعية، ڈاکٹر اسامہ صلابی)

رخصت پر عمل کا حکم

فقہاے اسلام کی رخصتوں اور غلطیوں کو دلیل بنا کر آسانیاں تلاش کرنا ایک مذموم عمل ہے۔ علماے کرام نے سختی کے ساتھ اس عمل کی ممانعت کی ہے۔ بعض فقہا جیسے علامہ ابن حزمؒ ظاہری، ابن عبد البرؒ مالکی، ابوالولیدؒ باجی، ابن صلاحؒ شافعی اور ابن نجارؒ حنبلی وغیرہ نے اس کی حرمت پر اجماع نقل کیا ہے۔ (مراتب الاجماع، ص ۵۸۔ جامع بيان العلم وفضله، ج۲، ص۹۱۔ حاشية الموافقات، ج۵، ص ۸۲۔ أدب المفتي والمستفتي، ص۱۲۵۔ شرح الكوكب المنير، ج۴، ص ۵۷۸)

● **فقہا کی آرا:** یہاں اہلِ علم کے چند اقوال کا ذکر کرنا مناسب ہوگا:

۱- خلیفہ راشد ثانی حضرت عمرؓ ابن الخطاب فرماتے ہیں: ''دین کو تین چیزیں مسمار کر سکتی

ہیں: کسی عالم کی لغزش، منافق کا قیل وقال اور ائمۃ المسلمین کی گمراہی''۔ (سنن دارمی، ج۱، ص۷۱۔ جامع بیان العلم وفضلہ، ج۲، ص۱۳۵)

۲- امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں: ''جو شخص علما کے نادر اقوال اختیار کرے گا وہ اسلام سے خارج ہو جائے گا''۔ (سیر أعلام النبلاء، ج۷، ص۱۲۶)

۳- عز بن عبدالسلامؒ کہتے ہیں: ''ائمہ میں سے کسی کی بھی تقلید کرنا جائز ہے لیکن رخصتوں کا تتبع جائز نہیں''۔ (فتاویٰ العز بن عبد السلامؒ، ص۱۲۲)

۴- امام ذہبیؒ کہتے ہیں: ''جو مسالک کی رخصتوں اور مجتہدین کی غلطیوں کی تلاش بسیار کرتا ہے، اس کی ایمانی حالت کمزور ہو جاتی ہے''۔ (سیر أعلام النبلاء، ج۸، ص۸۱)

۵- حضرت ابراہیم ابن علیہؒ کہتے ہیں: جو شخص بھی علمی شذوذ [منفرد راے] کی پیروی کرتا ہے، ضلالت اس کا مقدر ہوتی ہے''۔ (ذیل مذکرۃ الحفاظ، ص۱۸۷)

ویسے تو اس مسئلے میں کبار علماے اسلام نے بڑی تاکید کے ساتھ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے لیکن اختصار کے پیشِ نظر ہم نے صرف چند اقوال ہی کو نقل کیا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ مذکورہ بالا تمام اقوال کا حکم اس شخص کے لیے مخصوص ہے جو اتباعِ نفس، تساہل پرستی، شریعت سے اعراض یا تجاہل کے باعث ایسا کرتا ہے۔ البتہ اگر محرک یہ سب چیزیں نہیں ہیں تو درج ذیل شرائط کی رعایت کرتے ہوئے فقہی رخصتوں کو اختیار کیا جاسکتا ہے:

۱- رخصتوں کی اجازت دینے والے فقہا کے اقوال کو شرعی اعتبار حاصل ہو، یعنی ان کا شمار شذوذ میں نہ کیا جاتا ہو۔

۲- ان رخصتوں کے اختیار کرنے کی کوئی ضروری وجہ پائی جائے، مثلاً انفرادی یا معاشرتی سطح پر کسی واقعی مشقت کا ازالہ مقصود ہو۔

۳- رخصت اختیار کرنے والے کی علمی صلاحیت اتنی ہو کہ وہ بذاتِ خود فقہی مسائل میں بحث وتمحیص کرسکتا ہو، یا وہ کسی باصلاحیت خداترس عالم کے اعتماد پر ایسا کرے۔

۴- ان رخصتوں کا اختیار کرنا تلفیق کا سبب نہ بنتا ہو۔

۵- ان رخصتوں کو اختیار کرنے کا سبب کسی غیر شرعی مقصد کا حصول نہ ہو۔

۶- رخصت کے اختیار کرنے پر مکلّف کا دل آمادہ و مطمئن ہو۔(قرارات و توصیات مجمع الفقه الاسلامی الدولی، ص۱۵۹-۱۶۰)

اتباع رخصت کے مضر اثرات و نتائج

فقہی رخصتوں کا اتباع کرنے سے کچھ سلبی اثرات مرتب ہوتے ہیں، جو بسا اوقات بے حد سنگین منفی نتائج کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں۔ متعدد اہلِ علم حضرات خصوصاً امام شاطبیؒ، امام نوویؒ، علامہ ابن صلاحؒ اور علامہ ابن القیمؒ وغیرہ نے اس بارے میں تفصیل سے کلام کیا ہے۔ یہاں اس کی تلخیص مرتب انداز میں پیش کی جاتی ہے:

۱- رخصتوں کا اتباع کرنے سے اسلامی شریعت کے اصول و مقاصد کی مخالفت لازم آتی ہے۔ شریعت اسی لیے نازل ہوئی ہے کہ انسان اپنی خواہشاتِ نفس کی غلامی سے آزاد ہو جائے۔ جب کہ رخصتوں کا اتباع کرنے والا شخص ہمیشہ اپنی خواہشاتِ نفس کا اسیر بنا رہتا ہے۔

۲- رخصتوں کا اتباع تکالیفِ شرعیہ کے خلاف بلکہ عین تکلیفِ بشر کی ضد ہے، کیونکہ تتبع کی رو سے ہر شرعی حکم میں مکلّف کو جو چاہے کرنے کی آزادی مل جاتی ہے اور یہ بالآخر اسقاطِ تکلیف کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

۳- دلیل کی اتباع چھوڑ کر اختلاف کی اتباع کرنا، اسلام کے عمومی مزاج کے خلاف ہے۔ ارشادِ باری ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ (النساء ۴:۵۹) ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں، پھر اگر تمھارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریقِ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔

۴- رخصتوں کا اتباع کرنے سے دین اور احکامِ شرع کے لیے اہانت واستخفاف کا رویہ

پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ایک مرتبہ جب یہ سیلاب بہ نکلتا ہے، تو کوئی اخلاقی و دینی بند بھی اس کے آگے کام نہیں دیتا۔

۵- رخصتوں کا اتباع کرنے میں انسان معلوم و مبرہن چیز کو چھوڑ کر مجہول و غیر ثابت چیز کو اختیار کرنے کا عادی ہو جاتا ہے۔

۶- رخصتوں کا اتباع کرنے کے نتیجے میں شریعت کا سیاسی و حکومتی نظام پارہ پارہ ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کی بدولت اجتماعی قوانین کا نفاذ ناممکن ہو جاتا ہے جو عام انارکی و بدامنی پر منتج ہوتا ہے۔

۷- رخصتوں کا اتباع دیر سویر انسان کو تلفیق اور اجماع کی خلاف ورزی پر آمادہ کر دیتا ہے۔

اتباعِ رخصت دورِ حاضر میں

اس عنوان کے تحت ہم اختصار کے ساتھ مفتیان و مستفتین [سائلین] ہر دو حضرات کے موجودہ حالات کا مختصراً تجزیہ کریں گے۔

● **اہلِ افتا کی صورت حال:** عصرِ حاضر کے بعض مفتیان حضرات کے افتائی منہج کو دیکھ کر ڈر لگتا ہے کہ کہیں وہ مذمت و توبیخ جو علماے سوء کے بارے میں وارد ہوئی ہے، ان حضرات پر صادق نہ آتی ہو۔ آج بہت سارے نام نہاد اہلِ علم حضرات نے تیسیر اور تسہیل کو ایک علمی منہج کی حیثیت سے اپنایا ہوا ہے اور اس منہج کی تائید میں عام اور غیر منضبط دلائل کا طومار بھی کھڑا کیا جاتا ہے۔ لیکن ذرا غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے جملہ دلائل اس مقولے کی قبیل سے ہیں جس کو تاریخ نے کلمة حقٍ ارید بها الباطل کا نام دیا تھا، یعنی ایسا کلمۂ حق جس کا نتیجہ باطل ہو۔ ان حضرات کے تمام دلائل کا مجموعی خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ دین اپنے آپ میں آسان ہے اور اسلامی شریعت کا طرۂ امتیاز ہے کہ اس کی بنیاد سہولت و سماحت اور رفعِ حرج جیسے اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ لہٰذا اگر چند مسائل کے اندر ان اصولوں کی روشنی میں اپنے فقہی سرمایے سے سہولت پر مبنی اقوال کو ترجیح دے دی جائے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہیے۔ بہت سے کوتاہ بیں حضرات ان صحیح ابتدائی مقدمات سے دھوکا کھا جاتے ہیں، حالانکہ ان مقدمات سے جن نتائج کو برآمد کیا جاتا ہے، وہ اپنے فاسد و غلط ہونے میں کسی دلیل کے محتاج نہیں ہوتے۔ اگر شریعت اسلامی نے اپنی تکالیف میں یسر و سہولت کی رعایت کی ہے تو اس کا یہ لازمی نتیجہ کیسے برآمد کر لیا جائے کہ اب فقہی اقوال میں سے

جس کو دل چاہے اختیار کیا جاسکتا ہے۔ نفس پرستوں کے لیے رخصتیں چھانٹ کر فراہم کرنے اور اسلامی شریعت کی سادگی و آسانی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اور پھر شارع کی نافذ کردہ شرعی تکالیف کی مشقت کو کیسے کسی عالم یا فقیہ کے شذوذ کی بنیاد پر رفع کیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک بنیادی غلطی اور مغالطہ آمیزی ہوگی کہ ہم کسی صحیح اصل پر فاسد جزیے کی بنا رکھیں۔ مسئلے کی اس سنگینی کی وجہ سے ہی قدیم علماے اسلام نے بڑی شد و مد کے ساتھ اس کی ممانعت کی ہے (رفع الملام عن الأئمة الأعلام، ابن تیمیہؒ۔ اعلام الموقعین، ابن القیمؒ، ج ۱، ص ۸۷۔ المبدع، ابن مفلح، ج ۱۰، ص ۲۵۔ کشاف القناع، منصور بن یونس البھوتی، ج ۶، ص ۳۰۰)

طرفہ تماشا یہ ہے کہ بعض نام نہاد اہلِ علم حضرات، فقہا کے ان اقوال و آرا تک سے صرفِ نظر کر جاتے ہیں، جو واضح طور پر نصِ شرعی سے متصادم ہوتے ہیں۔ ایسے حضرات کی بھی کمی نہیں ہے جو عصری تغیّرات کا حوالہ دے کر اسلامی فقہ کی ازسرِ نو تدوین کا دم بھرتے نہیں تھکتے، حالانکہ اس طرزِ فکر کے جو مسموم اثرات و نتائج سامنے آئے ہیں اور بعض حضرات نے جس طرح قرآن و سنت کے خلاف بے سروپا افکار و خیالات اختیار کیے ہیں، وہ دیدۂ بینا کے لیے قابلِ عبرت و موعظت ہے۔ کہیں عورت کی امامت کو جواز بخشا جاتا ہے تو کہیں ارتداد اور دیگر جرائم کی شرعی حدود کے بطلان کی بات کی جاتی ہے۔ کہیں غنا و سرود کو مباح بتایا جاتا ہے تو کہیں ہر مسئلے میں مرد و عورت کی کامل مساوات کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ کہیں اجنبی عورت سے مصافحے اور تعارفی بوس و کنار کی وکالت ہوتی ہے تو کہیں قصاص کی ازسرِ نو تشریح و تعبیر کو لازمی قرار دیا جاتا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ملک کی قانون ساز کمیٹی کو تسلی دی جاتی ہے کہ وہ اپنے حساب سے جو بھی قانون بنانا چاہے بنائے، اس کو شرعی و فقہی استناد دینا ہمارا کام ہے۔ (ان اقوال کے لیے دیکھیے: التعالم وأثره على الفكر والكتاب، بکر ابو زید، ص ۱۲۲۔ ارسال الشواظ على من تتبع الشواذ، صالح شمرانی)

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا کسی عالم یا مفتی کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے اختیار وخواہش کے مطابق فتاویٰ کا انتخاب کرے؟ اور کیا کوئی مفتی اپنی یا مستفتی کی خواہش کی موافقت میں کسی فقہی قول پر فتویٰ دے سکتا ہے؟ امام ابن القیمؒ اس سوال کے جواب میں فرماتے ہیں: ''ایسا کرنا بہت بُرا فسق اور بہت بڑا گناہ ہے، واللہ المستعان'' (اعلام الموقعین، ج ۴، ص ۱۸۵)۔

امام شاطبیؒ نے اس سوال کے جواب میں علامہ ابوالولید باجیؒ کا یہ قول نقل کر دیا ہے: ''کسی کے لیے بھی جائز، مناسب اور حلال نہیں ہے کہ وہ اللہ کے دین میں ایسا فتویٰ دے جس کے حق ہونے کا وہ اعتقاد نہیں رکھتا، قطعِ نظر اس سے کہ اس کے فتوے سے کون راضی ہوتا ہے اور کون ناراض۔ مفتی کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کا حکم بتاتا ہے، پھر بھلا کیسے وہ اللہ کی طرف سے ایسا حکم بیان کرسکتا ہے جس کے حکمِ الٰہی ہونے کا وہ خود بھی معتقد نہیں۔ اللہ نے ایسے مواقع کے لیے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا تھا:

وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَ احْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ط (مائدہ ۵:۴۹) ''پس اے محمدؐ! تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تم کو فتنے میں ڈال کر اس ہدایت سے ذرہ برابر منحرف نہ کرنے پائیں جو خدا نے تمھاری طرف نازل کی ہے''۔ (الموافقات، ج ۵، ص۹۱)

مسئلے کی سنگینی کے پیشِ نظر متعدد اہلِ علم نے مفتی ہونے کی شرائط میں سے ایک شرط عدم تساہل اور عدم ترخیص پسندی [رخصت نہ دینا] کو بھی شامل کیا ہے۔ تساہل کی دو قسمیں ہوتی ہیں:

۱- دلائل اور طریقِ احکام کی طلب میں سہولت کوشی کرنا اس طرح کہ ناپختہ افکار و خیالات کو معتبر قرار دیتا ہو۔ ایسا شخص اجتہاد کا حق ادا نہیں کرتا اور اس کا فتویٰ دینا یا اس سے فتویٰ پوچھنا دونوں جائز نہیں۔

۲- رخصتوں کی طلب اور مشتبہ امور کی تاویل و توجیہ میں تساہل سے کام لیتا ہو۔ ایسا شخص اپنے دین میں کوتاہ اور مذکورہ بالا پہلی قسم کے متساہل سے کہیں زیادہ گناہ گار ہے۔ (قواطع الأدلة فی اصول الفقه، ابوالمظفر سمعانی، ج۳، ص ۴۳۸۔ البحر المحیط، بدرالدین زرکشی، ج۶، ص ۳۰۵)

حضرت قاضی اسماعیلؒ کہتے ہیں: ''میں عباسی خلیفہ معتضد باللہ کے یہاں حاضر ہوا تو اس نے ایک کتاب میرے ہاتھ میں دی۔ میں نے کتاب کے مشمولات کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ کسی چاپلوس درباری نے فقہا کی غلطیوں اور رخصتوں کو مع دلائل جمع کر کے خلیفہ کو خوش کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے کہا کہ اس کتاب کا مصنف ملحد و زندیق ہے۔ خلیفہ نے کہا: کیا اس کتاب میں

مذکورہ احادیث صحیح نہیں ہیں؟ میں نے کہا: احادیث تو درست ہیں لیکن جس فقیہ نے نبیذ کو حلال کہا ہے اس نے متعہ کو حرام مانا ہے، اور جس نے متعہ کو مباح کہا ہے اس نے نبیذ کو حرام مانا ہے۔ دیکھیے ہر فقیہِ دین کا کوئی نہ کوئی موقف غلط ہوتا ہے، لہٰذا جو شخص ان کی غلطیوں کو جمع کر کے اسے اسلام بتائے تو اس کا دین باقی نہیں رہتا۔ یہ سن کر خلیفہ نے اس کتاب کے تمام نسخوں کو جلانے کا حکم صادر کر دیا''۔ (السنن الکبریٰ، بیہقیؒ، ج ۱۰، ص ۳۵۶)

صحیح بات یہ ہے کہ شریعت کے اختلافی مسائل میں، بقول شاطبیؒ، قرآن کے وضع کردہ ضابطے کی پیروی کی جانی چاہیے۔ خواہشاتِ نفس کی پیروی کے بجاے ہمیں قرآن جو ضابطہ دیتا ہے وہ یہ کہ ہر متنازع معاملے میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف رجوع کیا جائے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ط ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا o (النساء ۴:۵۹) 'اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں، پھر اگر تمھارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریقِ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔

لہٰذا اگر کسی مسئلے میں دو مجتہدین میں اختلاف پایا جاتا ہے تو اس کا فیصلہ شرعی دلائل کی روشنی میں کیا جانا چاہیے۔ اور دو مسلکوں میں سے کسی ایک کو محض سہولت کوشی اور اتباعِ نفس کی خاطر راجح ماننا رجوع الی اللہ والرسول کے منافی ہے۔ (الموافقات، الشاطبیؒ، ج ۵، ص ۸۱-۸۲)

فتویٰ لینے والوں کی صورت حال

فتوے کے تعلّق سے ہمارے دینی بھائیوں میں جو عام رجحان پیدا ہو چلا ہے اس کے نمایاں خدوخال یہ ہیں:

(ا) تساہل پرستی و سہولت کوشی۔

(ب) قربِ الٰہی کے احساس کی کمی۔

(ج) مختلف المسالک علما حضرات کے اقوال کو آپس میں موضوعِ بحث بنانا۔

(د) شریعت پر عمل کرنے میں اپنی سہولت سے ترک وانتخاب کرنا۔

(ہ) ایک سے زیادہ علمائے کرام سے فتویٰ پوچھنا اور آسان ترین ودل پسند فتوے پر عمل کرنا۔

مذکور بالا اوصاف آج ہمارے بیش تر دینی بھائیوں کے طرزِ عمل پر صادق آتے ہیں۔ علمائے ربانیین نے ہمیشہ اس قسم کے غیر شرعی تصرفات پر شدت کے ساتھ نکیر فرمائی ہے، اور اس منحرف منہج کے پیروکاروں کو مختلف برے خطابات سے یاد کیا ہے۔ حضرت معمرؒ نے انھیں اللہ کے بدترین بندے کہا ہے (معرفة علوم الحديث، حاکم، ص ۵۶۔ تلخيص الحبير، ابن حجر، ج ۳، ص ۱۸۷)۔ علامہ ابن نجارؒ نے انھیں فسق سے موسوم کیا ہے (مختصر التحرير، ابن نجار، ص ۲۵۲)۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں: ''عام آدمی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ مختلف مسالک سے انتخاب کر کے ہر مسئلے میں آسان قول کو اختیار کرے'' (المستصفیٰ، ج ۲، ص ۴۶۹)۔ علامہ ابن عبدالبرؒ نے اس عمل کی حرمت پر اجماع نقل کیا ہے (جامع بيان العلم وفضله، ج ۲، ص ۹۱۔ شرح الکوکب المنیر، ابن نجار، ج ۴، ص ۵۷۸)۔ امام شاطبیؒ اور امام نوویؒ نے اس عمل کے منفی اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: ''اگر مستفتی ہر ہر مسئلے میں مختلف مسالک کی موجودہ گنجایشوں کا تتبع کرتا ہے، تو اس کا یہ عمل للّٰہیت سے دُوری، خواہشاتِ نفس کی پیروی اور شارع کی نافذ کردہ تمام حدود وقیود کو مسمار کرنے کے مترادف قرار پائے گا''۔ (الموافقات، ج، ص ۱۲۳۔ المجموع، ج ۱، ص ۵۵)

اہلِ علم نے فتویٰ حاصل کرنے کے لیے چار شرطیں تجویز کی ہیں:

۱- سائل کے استفتا کا مقصد حق سے آگہی اور اس پر عمل کا جذبہ ہو، نہ کہ گنجایشوں کی تلاش یا خواہشِ نفس کی پیروی۔

۲- فتویٰ ان لوگوں سے طلب کیا جائے جن کا علمی تبحر اور خداترسی وتقویٰ معلوم ومعروف ہو۔ مناسب ہوگا کہ اپنی دانست میں معتمد ترین اہلِ افتا کا انتخاب کیا جائے۔

۳- مسئولہ حالت اور سوال کو من وعن، درست اور تفصیل سے بیان کیا جائے۔

۴- مفتی صاحب کے جواب کو پوری توجہ اور بیدار مغزی سے سمجھنے کی کوشش کی جائے،

اگر کوئی نکتہ سمجھ میں نہ آئے تو استفسار کیا جائے۔خود سے اس کے معنیٰ ومفہوم کا تعیّن نہ کرے، اور نہ فتوے کے کچھ اجزا ہی کو لے کر باقی کو نظرانداز کرے۔

موجودہ المیہ اور حل

ہمارے زمانے کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ اس میں رخصتوں کو تلاش کرنا ایک رائج الوقت عمل بن گیا ہے۔اس بیماری کے عام ہونے میں بڑا ہاتھ بعض ٹی وی چینلوں اور انٹرنیٹ کی سائٹوں پر فتویٰ دینے والے نااہل مفتیان کرام کا بھی ہے، جب کہ دوسرا بڑا ہاتھ اس مغرب زدہ مسلم طبقے کا ہے جس کی ساری تگ ودو کا مقصد ومحور یہی بنا ہوا ہے کہ کسی بھی طرح ہر مغربی چیز کو اسلامی چوکھٹا فراہم کر کے مسلم معاشرے میں پھیلا دیا جائے۔ اب یہ اقامتِ دین کے لیے اٹھنے والی دینی تحریکوں اور جماعتوں کے وابستگان اور علما کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس دینِ حنیف پر مسلط اہلِ غلو کی غلط تحریفات، باطل پرستوں کے غلط انتسابات ودعوے اور جاہلوں کی دور ازکار تاویلات کا پردہ چاک کریں۔اس سلسلے میں چند تجاویز درج ذیل ہیں:

۱- اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت کو آخری مرجع وحاکم کی حیثیت دی جانی چاہیے اور کسی بھی حالت میں کسی بھی دینی مسئلے میں ان سے رُوگردانی کی روش نہ اختیار کی جائے۔ارشادِ باری ہے:

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ○ (النساء ۴:۶۵)
نہیں اے محمدؐ، تمھارے رب کی قسم، یہ کبھی مومن نہیں ہوسکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ محسوس کریں بلکہ سربسر تسلیم کرلیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ط ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ○ (النساء ۴:۵۹) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں، پھر اگر تمھارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہوجائے تو اسے

اللہ اور رسولؐ کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریقِ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔

قرآن وسنت کا وہی فہم معتبر ومعتمد علیہ ہونا چاہیے جو صحابہ کرامؓ نے سمجھا تھا۔ کیونکہ وہ حضرات قرآن وسنت کی عملی تطبیق وتنفیذ کے چشم دید گواہ رہے ہیں اور اللہ کے رسولؐ نے ان کا تزکیہ فرمایا ہے، نیز ان کے نہج سے تمسک کا حکم دیتے ہوئے اس کے خلاف امور کو بدعتِ محدثہ قرار دیا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے: ''تمھارے بہترین لوگ میرے زمانے کے ہیں، پھر اس کے بعد والے پھر اس کے بعد والے...''۔ [خیر کم قرنی ثمّ الذین یلونھم ثمّ الذین یلونھم...] (بخاری، حدیث ۲۶۵۱۔ مسلم، حدیث ۶۶۳۸)۔ ''تم پر لازم ہے کہ میری اور ہدایت یافتہ خلفاے راشدین کی سنت کو مضبوطی سے تھام لو، اور کس کر دانتوں سے دبا لو۔ اور خبردار، دین میں پیدا ہونے والے امور سے بچنا، کیونکہ دین میں ہر نیا معاملہ بدعت ہے اور ہر بدعت ایک گمراہی ہے''۔ [علیکم بسنتی وسنة الخلفاء المھدیین الراشدین تمسکوا بھا وعضوا علیھا بالنواجذ، وایّاکم ومحدثات الأمور فانّ کلّ محدثةٍ بدعة وکلّ بدعةٍ ضلالة] (سنن ابوداؤد، حدیث ۴۶۰۷۔ سنن ترمذی، حدیث ۲۶۷۶۔ سنن ابن ماجه، حدیث ۶۲)

۲- اجماع کی حجیت کو تسلیم کیا جائے اور اس کو توڑنے یا اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوششوں پر سخت موقف اختیار کیا جائے۔ ارشادِ باری ہے:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا ۝ (النساء ۴:۱۱۵)، مگر جو شخص رسول کی مخالفت پر کمر بستہ ہو اور اہلِ ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے، درآں حالیکہ اس پر راہِ راست واضح ہو چکی ہو، تو اس کو ہم اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور اسے جہنّم میں جھونکیں گے جو بدترین جاے قرار ہے۔

۳- مختلف فیہ مسائل میں ایسے علماے کرام کی طرف رجوع کیا جائے جن کا صلاح وتقویٰ اور علمی تبحر مسلم ہو۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَ اِذَا جَآءَ هُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ط وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰٓى اُوْلِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ط وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا o (النساء ۴:۸۳) یہ لوگ جہاں کوئی اطمینان بخش یا خوف ناک خبر سن پاتے ہیں، اسے لے کر پھیلا دیتے ہیں، حالانکہ اگر یہ اسے رسول اور اپنی جماعت کے ذمہ دار اصحاب تک پہنچائیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آجائے جو اِن کے درمیان اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کرسکیں، تم لوگوں پر اللہ کی مہربانی اور رحمت نہ ہوتی تو (تمھاری کمزوریاں ایسی تھیں کہ) معدودے چند کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ گئے ہوتے۔

فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (النحل ۱۶:۴۳) ''اہلِ ذکر سے پوچھ لو اگر تم لوگ خود نہیں جانتے''۔

(۴) عوام الناس کو تتبع کے مہلک راستے اور اس کی مضرتوں سے آگاہ کیا جائے اور اس سلسلے میں تقاریر، خطبے، کتابیں، کیسٹس، رسالے، لیکچر اور انفرادی نصیحتوں وغیرہ جیسے وسائل سے کام لیا جائے۔

(۵) اس خطرے کے اسباب ومحرکات پر غور وخوض کرنے، نیز ان کا ازالہ کرنے کے لیے مختلف سطحوں پر علمی مذاکرے اور ورک شاپوں کا انعقاد کیا جائے۔

(۶) ٹی وی چینلوں اور انٹرنیٹ سائٹوں پر فتویٰ دینے کے لیے ایسے حضرات کا تقرر یقینی بنایا جائے جو علمی تبحر، فہمِ سلیم، حسنِ پیش کش اور اعترافِ خطا جیسی اعلیٰ صفات سے متصف ہوں۔

(۷) اس قسم کی کسی بھی راے یا موقف کا فوری محاسبہ کیا جائے اور اس عادت کے خوگر افراد پر مختلف اخلاقی طریقوں سے دباؤ ڈال کر اس عادتِ قبیحہ کے ترک پر آمادہ کیا جائے۔

★ مقالہ نگار، اسلامی یونی ورسٹی، مدینہ منورہ سے وابستہ ہیں

سنوسی تحریک

ڈاکٹر ظفر حسین ظفر*

سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں مسلمانوں کے سیاسی زوال کی تکمیل کے ساتھ ہی مغربی نوآبادیاتی طاقتوں کا ظہور ہوا۔مغربی طاقتوں نے نہ صرف عسکری بالادستی قائم کی، بلکہ اپنی تہذیب سے بھی مسلم معاشروں کو مرعوب کر دیا۔مسلم دنیا کی اکثریت اِس عسکری اور تہذیبی یلغار کا مقابلہ کرنے کی سکت سے تہی دامن تھی۔ جمود، تقلید اور ملوکیت جیسے عارضے مسلم معاشروں کو پہلے ہی کھوکھلا کر چکے تھے۔مغرب کے عسکری، سیاسی، تہذیبی اور سائنسی طوفان کے سامنے مسلمانوں کی بے بسی تاریخ کا ایک سنگین المیہ ہے۔

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ زوال پذیر مسلم معاشروں میں مغربی بالادستی کے خلاف ایک ہی وقت میں احیائی اور اصلاحی کوششیں شروع ہوئیں۔ان احیائی تحریکوں نے جہاد اور اجتہاد کو اپنا سلوگن بنایا۔جمودزدہ ملّت میں حرکت اور ارتعاش کی ایسی فکری اور نظریاتی بنیادیں ان تحریکوں نے اٹھائیں کہ آج دنیا کے ہر خطے میں ان کے اثرات محسوس کیے جا رہے ہیں۔حضرت شاہ ولی اللہ اور محمد بن عبدالوہاب کو ان اسلامی تحریکوں کا پہل کار تصور کیا جاتا ہے۔ان کی وفات کے بعد دنیا کے مختلف خطوں میں بے شمار اسلامی احیائی تحریکیں منظّم ہوئیں۔شمالی افریقہ کی سنوسی تحریک، مہدی سوڈانی کی تحریک، اخوان المسلمون (مصر، عراق، شام)، برعظیم پاک و ہند کی تحریکِ مجاہدین، فرائضی تحریک (بنگال) اور جماعت اسلامی (ہندو پاکستان) جیسی تحریکیں انیسویں اور بیسویں صدی میں شروع ہوئیں۔ان تحریکوں کی تنظیمی ساخت اور طریق کار مختلف ہونے کے باوجود مقصد کی یکسانیت نے انھیں ایک احیائی کہکشاں بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی کے مطابق: شمالی افریقہ کے اندر سنوسی تحریک بہت بڑی اور احیاے اسلام کی سب سے کامیاب تحریک تھی۔ اس کی بنیاد الجزائر کے صوفی رہنما اور مجاہد سیّد محمد ابن السنوسی نے رکھی۔ اس نے مسلمانوں کی ازسرِ نو بیداری میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس تحریک نے عرب اور شمالی افریقہ کے ممالک میں تاریخی واقعات پر گہرا اثر ڈالا، خصوصاً حجاز، مصر، لیبیا، الجزائر، شمالی نائیجیریا، چاڈ اور جنوب مغربی سوڈان اس میں شامل ہیں۔

سنوسی تحریک کا مقصد کتاب و سنت کی اساس پر عالم اسلام کا مکمل دینی احیا تھا۔ اس سلسلے میں دو باتیں خاص اہمیّت کی حامل ہیں، ایک ردِ بدعات اور دوسری اجتہاد۔ سنوسی الکبیر اس بات پر زور دیتے تھے کہ وہ باتیں جن کی سند قرآن و سنت سے نہیں ملتی، وہ ترک کر دینی چاہییں اور اُس اسلام کی طرف رجوع کرنا چاہیے، جو دورِ اوّل میں روبہ عمل تھا۔ وہ اس بات پر بھی زور دیتے تھے کہ اجتہاد کے دروازے اب بھی کھلے ہیں۔

سنوسی، احیاے اسلام کی منظم اور مربوط جدوجہد پر یقین رکھتے تھے۔ یہ تحریک اسلام کا حقیقی اور انقلابی تصور رکھتی تھی اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کو صحیح اسلامی اقدار کی حامل بنانا چاہتی تھی۔ اس تحریک کی غرض و غایت کسی ذاتی ریاست یا امارت کا حصول نہ تھا، بلکہ سنوسی یہ چاہتے تھے کہ تنظیمی بنیاد پر اسلام کے سیاسی، معاشی، اخلاقی اور تمدّنی نظام کو اس کی حقیقی صورت میں بحال کیا جائے۔

اس تحریک کے بانی سیّد محمد بن علی السنوسی (۱۷۸۷ء-۱۸۵۹ء) موجودہ الجزائر کے علاقے مستغانم کے گاؤں وسیتا میں پیدا ہوئے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ سنوسی ان کا خاندانی لقب تھا، جو ان کے روحانی جدامجد شیخ محمد ابن یوسف بن عمر بن شعیب السنوسی (۱۴۹۰ء) سے منسوب ہے۔ سیّد غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے۔ آپ نے بچپن ہی میں قرآن مجید حفظ کیا۔ فقہ، حدیث اور دوسرے علوم سیکھے۔ اس کے بعد سیّد ایک پرانے اسلامی مرکز مزونا میں مزید تعلیم کے لیے چلے گئے۔ ان کے قلب و ذہن میں یہ احساس بچپن ہی سے پروان چڑھ رہا تھا کہ امّتِ مسلمہ دوسروں کی دست نگر بن گئی ہے اور امت کو موجودہ کیفیت سے نکالنے کے لیے اپنے حصّے کا کام کرنا چاہیے۔

۱۸۰۴ء میں فاس کی قاراوین یونی ورسٹی چلے گئے، جہاں انھوں نے مزید تعلیم مکمل کی۔ یونی ورسٹی کے دوران سیّد صاحب کا رجحان تصوّف کی جانب ہوا۔ فاس میں قیام کے دوران پہلے

آپ صوفیہ کے مشہور سلسلہ تاجنیہ سے منسلک ہوئے، جو بعد ازاں شیخ احمد بن ادریس سے گہرے تعلّق پر منتج ہوا۔ اسی دوران میں سیّد عالم عرب کی مشہور اسلامی تحریک (وہابی تحریک) سے متاثر ہوئے۔ اس کا بہت امکان ہے کہ ۱۴۴۶ء میں سیّد نے عرب کی اس تحریک توحید سے جو محمد ابن عبدالوہاب نے شروع کی تھی اثرات قبول کیے۔ (ایضاً، ص ۷۶)

آپ نے ۱۸۱۸ء میں فریضۂ حج ادا کیا۔ ۱۸۳۱ء میں مصر پہنچے، جہاں الازہر یونی ورسٹی میں شعبہ تدریس سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۸۳۲ء میں آپ مکہ معظّمہ چلے گئے، جہاں آپ ۱۸۴۰ء تک مقیم رہے۔ قیام مکہ کے دوران آپ تصوّف کے مشہور سلسلے ادریسیہ سے منسلک ہو گئے۔ بہ ایں ہمہ محمد علی بن سنوسی 'سلسلۂ ادریسیہ' کے ساتھ ساتھ 'وہابی تحریک' کے بارے میں بھی نرم گوشہ رکھتے تھے۔ معاصر حالات کے گہرے تجزیے کے بعد سیّد محمد بن علی السنوسی نے احیاے اسلام اور اتحادِ اُمّت کے عالم گیر تصور کے مطابق ایک منظّم تحریک شروع کرنے کا حتمی فیصلہ کیا۔ اب وقت آچکا تھا کہ مسلمانوں کے احیا کی وہ تحریک چلائی جائے جو مسلم امہ کا ایک بڑا دلربا اور محبُوب خواب تھا۔ ۱۸۳۷ء میں انھوں نے پہلا سنوسی زاویہ (خانقاہ) کی مکہ میں بنیاد رکھی۔

مکّہ میں قیام کے دوران سیّد صاحب نے علما اور دیگر لوگوں کے ساتھ گہرا رابطہ رکھا۔ بالآخر انھوں نے مکہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۸۴۰ء میں مکّہ سے روانگی سے قبل انھوں نے سنوسی تحریک کے مستقبل کے صدر مقام کا انتخاب کرنا تھا، ان کی خواہش تھی کہ یہ اسلامی دنیا کے مرکز میں اور مغربی طاقتوں کے اثر سے دور واقع ہو۔ مزید برآں روایتی علما کی مزید مخالفت سے بچنے کے لیے وہ تہذیب وثقافت کے قدیم مراکز سے دُور ہونا چاہتے تھے۔

وہ مکہ سے مصر پہنچے۔ یہاں بلاق میں تین مہینے انھوں نے قیام کیا، بعد ازاں 'فیوم' سوا اور تریپولی میں بھی قیام کیا اور سنوسی تحریک کا مستقل مرکز قائم کرنے پر غوروخوض جاری رکھا۔ بالآخر بن غازی کے مقام پر سنوسی تحریک کا مرکز بنا لیا گیا۔

'بن غازی' لیبیا کے ساحلی علاقے میں واقع تھا اور یہ مقام سنوسی قائدین کی خاص حکمت عملی کے باعث منتخب کیا گیا تھا۔ زاویوں کی تعداد میں تسلسل کے ساتھ اضافہ شروع ہوا، طرابلس' سوڈان اور افریقہ کے بیش تر علاقوں میں سنوسی تحریک کے واضح اثرات محسوس کیے جانے لگے، تو محمد علی

السنوسی نے سنوسی تحریک کا مرکز گہرے تجزیے کے بعد سیاسی اور جغرافیائی اہمیّت کے حامل علاقے جغبوب میں منتقل کر دیا۔ سیّد اکتوبر ۱۸۵۶ء کے وسط میں یہاں پہنچے۔ جغبوب اہم تجارتی راستوں کا مرکز اور حجاج کرام کا معروف راستہ تھا اور معاصر عالمی طاقتوں کی باہمی آویزش سے بھی دور تھا۔ سیّد کی تحریک کے اثرات جلد ہی تیونس، لیبیا، مصر کے مغربی صحرا، سوڈان اور دوسرے افریقی علاقوں میں پھیل گئے۔

جغبوب میں منتقلی کے تین سال بعد سیّد ستمبر ۱۸۵۹ء میں فوت ہوئے اور جغبوب یونی ورسٹی کیمپس میں دفن ہوئے۔ سیّد کی وفات کے بعد ان کے بڑے بیٹے سیّد محمد المہدی السنوسی تحریک کے سربراہ مقرر ہوئے۔ المہدی سنوسی کی قیادت میں سنوسی تحریک کے کام میں وسعت آئی۔ 'سنوسی اخوان' کی تعداد ۴۰ لاکھ تک پہنچ گئی۔ اس علاقے میں کوئی مقام ایسا نہ تھا، جہاں تک سنوسی تحریک کی دعوت نہ پہنچی ہو اور زاویہ قائم نہ ہوا ہو۔

المہدی سنوسی کی وفات کے بعد سیّد احمد الشریف السنوسی (۱۸۷۵ء-۱۹۳۳ء) سنوسی تحریک کے امیر مقرر ہوئے۔ سنوسی تحریک نے عالمِ اسلام کو پیش آنے والے ہر مسئلے پر توجہ دی اور اس پر ردعمل کا اظہار بھی کیا۔ سنوسی اتحادِ عالمِ اسلام کے داعی اور پر جوش حامی تھے۔ چنانچہ عالمِ اسلام کے اتحاد کے خلاف ہونے والی استعماری سازشوں پر سنوسی بہت بے چین تھے۔ ان ہی عالمی سازشوں میں سے ایک سازش عرب نیشنلزم تھا۔ خلافتِ عثمانیہ کے حصے بخرے استعماری ایجنڈا تھا۔ سنوسی تحریک نے اس مرحلے پر ترکوں کا ساتھ دیا۔ علامہ اقبال نے بھی سنوسی تحریک کی تحسین کی ہے ؎

کیا خوب امیرِ فیصل کو سنوسی نے پیغام دیا
تُو نام و نسب کا حجازی ہے، پر دل کا حجازی بن نہ سکا

تحریک و دعوت میں وسعت تو ہوئی، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ تحریک میں داخلی مسائل بھی جنم لیتے رہے۔ ۱۹۱۶ء میں سیّد ادریس اور سیّد احمد الشریف کے درمیان اختلافات ہوئے، جس کے نتیجے میں سیاسی و عسکری قیادت سیّد ادریس کے سپرد ہوئی، جب کہ روحانی و تعلیمی محاذ سیّد احمد کے سپرد ہوا۔

سیّد ادریس نے اطالویوں اور برطانوی ذمہ داران کے ساتھ مذاکرات شروع کیے۔

سیّد احمد پہلے جغبوب گئے، لیکن برطانوی حکام نے انھیں وہاں سے نکلنے پر مجبُور کیا۔ بالآخر آپ ۱۹۱۸ء میں ترکی چلے گئے جہاں کمال اتاترک کی حکومت میں آنے کے بعد وہاں سے نکال دیے گئے ۔ بیروت، یروشلم سے ہوتے ہوئے مدینہ چلے گئے، جہاں انھوں نے معروف سکالر محمد اسد سے مل کر سنوسی تحریک کو مسائل اور چیلنجوں سے نکالنے کا منصوبہ بنایا۔ بے بسی کے عالم میں وہ مصر پہنچے، اس موقع پر غازی عمر مختار منظر عام پر آئے۔ سنوسی اخوان کو مخدوش حالات میں چھوڑتے ہوئے سیّد ادریس مصر چلے گئے۔ غازی عمر مختار جو ایک بہادر جنرل تھے، انھوں نے سنوسی اخوان کی ملٹری کمانڈ خود سنبھال لی۔

عمر مختار طلسماتی شخصیت کا حامل جرنیل تھا ،نو آبادیاتی نظام کے خلاف ۳۰ برس تک جدوجہد کرتا رہا۔ عمر مختار نے سنوسی تحریک کی قیادت بہت نازک اور مشکل مرحلے پر کی۔ برطانوی اور اطالوی فوجوں کے خلاف وہ ایک چٹان کی طرح ڈٹا رہا۔ بلاشبہہ عمر مختار کو مشہور مسلم سپہ سالاروں ’موسیٰ بن نصیر‘ طارق بن زیاد‘ محمد بن قاسم‘ صلاح الدین ایوبی‘ عقبیٰ بن نافع کی صف میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ عمر مختار تین عشروں تک متواتر جہاد میں مصروف رہا۔ اپنی زندگی کے آخری ۲۰ مہینوں میں جب عمر ۵۷سال تھی، وہ ۲۳۶ مرتبہ اپنے سے کئی گنا فوج کے خلاف لڑا، اور سنوسی تحریک کے ساتھ غیر متزلزل وابستگی کا ثبوت دیا۔

سیّد محمد بن علی السنوسی کی تحریک کا بنیادی مقصد ’’مسلمانوں کی اصلاح، فرنگی استعمار کی مدافعت اور اسلام کی اشاعت تھا۔ ۲۲ برس کے عرصے میں انھوں نے ایک ایسی زبردست جماعت تیار کرلی، جس کا نظام سلطنتوں کے نظام سے زیادہ مکمل تھا، جس کا ہر شخص جماعتی مقاصد کی لگن میں ڈوبا ہوا تھا‘‘۔ (ابوالاعلیٰ مودودی، الجمعیۃ، دہلی، ۲۲ جولائی ۱۹۲۵ء)

سنوسی تحریک کے اثرات بہت گہرے اور دور رس تھے۔ لیبیا اور شمالی افریقہ کے بدو قبائل تک اپنا پیغام پہنچانے میں کامیاب ہوئے۔ احیاے اسلام کے لیے سنوسی تحریک نے جن امور کی طرف علی الخصوص اہمیّت دی تھی، ان میں ردِّ بدعات اور اجتہاد کو فوقیت حاصل تھی۔ سنوسی تحریک کا یہ ایک واضح رجحان رہا کہ اسلام میں ایسی اصلاحات کر دی جائیں، جن سے یہ روح اسلام سے قطع نظر کیے بغیر زمانہ حاضر کے تقاضوں کی تکمیل کر سکے۔

مسلم نشاتِ ثانیہ کی یہ عظیم الشان تحریک کم وبیش ایک صدی تک اپنے ہمہ گیر اثرات مرتب کر کے ذیل کے عوامل کے باعث رو بہ زوال ہوئی:

۱- برطانیہ' فرانس' اور اٹلی کے خلاف طویل اور تھکا دینے والی جنگیں۔

۲- ذرائع وسائل کی قلت کے باعث وسیع تحریک کو مربوط نہ کیا جاسکا۔

۳- مختلف علاقوں، زبانوں کے افراد کا مجتمع ہونا اور کسی ایک فکری وحدت میں سمویا نہ جانا۔

۴- روایتی ذرائع آمد ورفت، مثلاً صرف اونٹوں کا استعمال۔

۵- سنوسی تحریک کے بانی محمد ابن السنوسی کی وفات کے بعد قیادت پر ان کے بیٹے کا متمکن ہونا اور اس کے بعد ایک سینئر لیڈر کے بیٹے کو قیادت پر فائز کرنا، سیّد محمد ادریس کی جانب سے قیادت کے مسئلے پر تنازع کھڑا کر دینا......

۶- سیّد ادریس (المھدی کے بیٹے) قیادت کی صلاحیت نہ رکھتے تھے، مشکل وقت میں انھوں نے تنازع کھڑا کیا۔ سیّد احمد الشریف تحریک کی فعال ذمہ داریوں سے سبک دوش ہوئے۔

۷- وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جوش عمل میں کمی آئی، رضا کارانہ کام کرنے والے کارکن کم ہوتے گئے اور قائدین اور رہنماؤں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔

مصر، تیونس اور اب لیبیا کے عوام نے استعمار اور اُس کے ایجنٹوں کے خلاف ایک جنگ جیت لی ہے۔ انسانی خدائی کا جوا ہمیشہ کے لیے اپنی گردنوں سے اتارنے کا معرکہ ابھی جاری ہے۔ تاریخ کا یہ سفر لمحوں میں طے نہیں ہوا۔ یہ صدیوں پر مشتمل ایک تاریخی عمل ہے۔ مصر کی اخوان المسلمون ہو، یا شمالی افریقہ کی سنوسی اخوان، اس جدوجہد کے پس منظر میں اُن کا کردار نمایاں اور نکھرا ہے۔

ماخذ: ڈاکٹر محمود احمد غازی سنوسیہ تحریک شمالی افریقہ میں (انگریزی)، اور ڈاکٹر معین الدین عقیل، اقبال اور جدید دنیاے اسلام۔

★ مضمون نگار گورنمنٹ کالج راولا کوٹ، آزاد کشمیر میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔

مصر: حقیقی تبدیلی کا آغاز

عبدالغفار عزیز

علی سخیری جو خود بھی آٹھ سال تک جیل میں گزار چکا ہے، اس بار ملا تو ہمراہ ایک اور ساتھی بھی تھا۔ علی نے تعارف کروایا: یہ عبداللہ ہیں ۱۴سال صرف اس جرم کی پاداش میں جیل میں رہے کہ تعلّق اخوان سے ہے۔ میں نے احترام و محبت سے پوچھا: ۱۴سال کا پہاڑ سا عرصہ کیسے گزارا؟ عبداللہ نے مسکراتے ہوئے صرف ان تین لفظوں میں جواب دیا: ''الحمد للہ گزر گیا''۔ میں نے اجر و جزا کی دُعا دیتے ہوئے، تفصیل معلوم کرنے کے لیے دوبارہ اصرار کیا تو کہنے لگا: اب اس تلخ حقیقت کو صرف محسوس کیا جاسکتا ہے زبان پر لانا مشکل ہے۔ تیسری بار میرے اصرار پر کہنے لگا: وہ انسان سے اس کا فخر انسانیت چھین لیتے ہیں۔ تم صرف اسی بات سے اندازہ لگالو کہ ایک بار ہم ۱۰ساتھیوں نے تمام تر پابندیوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے باجماعت نماز ادا کی، لیکن اس حالت میں کہ ہم میں سے کسی کے بدن پر کپڑے کی دھجی تک نہ تھی۔ اس صورت حال پر کوئی احتجاج کرتا تو اسے کئی کئی مہینوں کے لیے صرف ڈیڑھ میٹر لمبی چوڑی کوٹھڑی میں بند کردیا جاتا، جہاں صرف وہ ہوتا اور پتھریلی دیواریں۔ علی اور عبداللہ جیسے ایک دو نہیں ہزاروں افراد ہیں۔ مرد ہی نہیں خواتین بھی گذشتہ ۶۴ برس سے اسی چکی میں پس رہی تھیں۔ ۲۰۱۱ء کا جنوری شروع ہوا تو دنیا کا کوئی شخص سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چھلنی روح اور زخمی جسموں والے ان لاکھوں افراد کو اس بدترین ظلم و استبداد سے نجات مل جائے گی، لیکن ۲۰۱۱ء کا سال ختم ہونے سے پہلے پہلے اس قماش کے کئی جابر حکمران عبرت کا نشان بن گئے، جیلوں کی کوٹھڑیوں میں روندے جانے والوں کو قوم نے اپنے ماتھے کا جھومر بنانے کا اعلان کردیا۔ ظالم حکمرانوں کے سرپرست واویلا کرنے لگے اسلامسٹ آ گئے۔

رب ذوالجلال کا فیصلہ غالب آیا: وَ نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ○ (القصص ۲۸:۵) ''اور ہم یہ ارادہ رکھتے تھے کہ مہربانی کریں ان لوگوں پر جو زمین میں ذلیل کر کے رکھے گئے تھے اور اُنھیں پیشوا بنادیں اور انھی کو وارث بنائیں''۔

مراکش، تیونس اور مصر کے حالیہ انتخابات صرف اس حوالے سے ہی اہم ترین نہیں قرار پائے کہ ان میں اسلامی تحریک نے باقی تمام سیاسی جماعتوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے، بلکہ اس حوالے سے بھی اہم تھے کہ ان ملکوں میں پہلی بار اس طرح کے آزادانہ، منصفانہ اور شفاف انتخاب منعقد ہوئے۔ معروف تجزیہ نگار رابرٹ فِسک بھی یہ لکھنے پر مجبور ہوگیا کہ ''صبح سویرے ایک ایک کلومیٹر لمبی لائنوں میں لگے مصری عوام کے سامنے مغربی جمہوریت شرما اور گہنا کر رہ گئی ہے۔ پولنگ کی رات ہونے والی بارش نے سردی میں مزید اضافہ کر دیا تھا، لیکن مصری عوام کے جوش و خروش اور صبر و تحمل میں کوئی سرد مہری پیدا نہ ہوئی''۔

● **انتخابی نظام**: مصر کے انتخابی نتائج اور مستقبل کے امکانات کا جائزہ لینے سے پہلے آیئے ایک نظر اس کے انتخابی نظام پر بھی ڈال لیں۔ حسنی مبارک کے بعد بننے والے عبوری نظام کے مطابق انتخابات کو متناسب نمایندگی اور انفرادی اُمیدواروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ۴۹۸ نشستوں میں سے ایک تہائی انفرادی اُمیدواروں کے لیے اور دو تہائی متناسب نمایندگی کی بنیاد پر پارٹیوں کے لیے مخصوص کی گئی ہیں۔ ہر ووٹر دو پرچیاں ڈالتا ہے، ایک پارٹی کے نشان کو اور دوسری افراد اور ان کے نشان کو (واضح رہے کہ الاخوان المسلمون کی سیاسی جماعت الحریۃ والعدالۃ 'آزادی وانصاف پارٹی' کا نشان ترازو ہے)۔ انفرادی طور پر جیتنے کے لیے ڈالے گئے ووٹوں کا ۵۰ فی صد +۱، یعنی نصف ووٹوں سے ایک ووٹ زیادہ حاصل کرنا ضروری ہے۔ اگر پہلے مرحلے میں فیصلہ نہ ہو سکے تو ان نشستوں پر دوبارہ ووٹنگ کروائی جاتی ہے۔ اس طرح انفرادی نشستوں پر جیتنے والے کے سامنے ایک مشکل ہدف ہوتا ہے۔ ان کے حلقے کی وسعت کا اندازہ اس امر سے لگا لیجیے کہ پہلے مرحلے میں اخوان کے دو اُمیدوار کامیاب ہوئے۔ ان میں سے ایک نے ۴ لاکھ ۳۰ ہزار ووٹ حاصل کیے تھے۔

پورے مصر کو تین حصوں میں تقسیم کر کے مرحلہ وار انتخاب کروائے جارہے ہیں۔ ووٹنگ

دو روز تک جاری رہتی ہے، جب کہ گنتی عموماً تین چار روز تک جاری رہتی ہے۔ اس طرح ایک حصے کے انتخاب کا عمل مکمل ہونے میں ۱۰،۱۲ روز لگ جاتے ہیں۔ پورا انتخابی عمل عدلیہ کی زیرنگرانی ہو رہا ہے۔ ہزاروں جج تینوں مرحلوں میں ملک کے مختلف اضلاع میں جا کر انتخابات کروا رہے ہیں۔ اب تک دو مرحلے مکمل ہو چکے ہیں، جب کہ تیسرے مرحلے کے انتخابات کے لیے ۱۹ جنوری کی تاریخ مقرر کی گئی ہے۔ ۲۳ دسمبر کو ہونے والے مظاہروں کے بعد اعلان کیا گیا کہ قومی اسمبلی کا پہلا اجلاس ۲۳ جنوری کو منعقد ہوگا۔ قومی اسمبلی کو 'مجلس الشعب' اور سینیٹ کو 'مجلس الشوریٰ' کا نام دیا گیا ہے۔ سینیٹ کے لیے بھی عام انتخابات ہوتے ہیں۔ یہ انتخابات ۲۹ جنوری سے شروع ہونا ہیں جو ۱۱ مارچ تک مکمل ہوں گے اور پھر ۳۰ جون ۲۰۱۲ء سے پہلے پہلے صدارتی انتخاب ہونا ہے۔ اس طرح ۲۸ نومبر ۲۰۱۱ء سے شروع ہونے والا انتخابی عمل اگلے سال کے وسط میں مکمل ہوگا۔

● **خطرات**: مصری عوام کو ان کی بے مثال قربانیوں کے ثمرات سے محروم کرنے کے لیے مہیب سازشیں بھی اول روز سے ہو رہی ہیں۔ حسنی مبارک کی رخصتی کے بعد عبوری عسکری کونسل نے تمام سیاسی جماعتوں اور دستوری کمیٹی کے مشورے سے عبوری دستور اور انتخابات کا روڈ میپ پیش کیا اور ۱۹ مارچ ۲۰۱۱ء کو اس پر عوامی ریفرنڈم کا اعلان کیا۔ کچھ عناصر نے ریفرنڈم کا بائیکاٹ کرتے ہوئے پہلے دستور بنانے کا مطالبہ کر دیا تاکہ ایک آمر کے جانے کے بعد دوسرا فوجی جنرل حسب سابق اور حسب خواہش دستور سازی اور انتخابات کا ڈراما بھی رچا لے۔ لیکن الحمدللہ ایک کامیاب ریفرنڈم تکمیل کو پہنچا، عوام نے نہ صرف بھرپور شرکت کی بلکہ ۷۷ فی صد ووٹ اس کے حق میں پڑے۔

عبوری دستور اور انتخابی طریق کار کے بارے میں مطمئن ہو کر عوام انتخابات کی تیاریوں میں لگ گئے، لیکن پھر ریفرنڈم کا بائیکاٹ کرنے والے عناصر نے انتخابات سے پہلے دستور بنانے کے لیے باقاعدہ تحریک شروع کر دی۔ اس مطالبے میں محمد البرادعی اور عمرو موسیٰ جیسے صدارتی اُمیدوار بھی شامل ہو گئے اور اعلان کیا گیا کہ ہم ۱۵ ملین دستخط جمع کر کے محضرنامہ تیار کریں گے کہ انتخاب ملتوی کر کے پہلے دستور بنایا جائے۔ اخوان نے کسی تصادم میں پڑے بغیر درجنوں دیگر جماعتوں کو اپنے ساتھ ملاتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا کہ بھرپور عوامی ریفرنڈم نے روڈ میپ طے کر دیا ہے، اب کسی بھی مرحلے میں اور کسی بھی شخص یا ادارے کو عوامی فیصلہ تبدیل کرنے کا

حق نہیں۔ انتخابات چند ماہ ملتوی تو کیے گئے لیکن بالآخر انتخابی عمل شروع ہوگیا۔ سازشی عناصر بھی باز آنے والے نہیں ہیں۔ پہلے دستور کی رٹ کام نہ آئی تو ملک میں اچانک مسلم مسیحی فسادات شروع کروا دیے گئے۔ توڑ پھوڑ اور قتل و غارت ہوئی لیکن بالآخر فتنے کی یہ آگ بھی بجھ گئی۔ کُلَّمَآ اَوْ قَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ (المائدہ ۵:۶۴) ''جب کبھی یہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ اس کو ٹھنڈا کر دیتا ہے''۔ پھر میدان التحریر میں دوبارہ دھرنا اور ہنگامے شروع کر دیے گئے۔ اخوان اس تحریک میں شامل نہ ہوئے اور انتخابات ہی کو اصل علاج قرار دیا لیکن ایک موقع ایسا آیا کہ عسکری کونسل کی طرف سے ایسے بیانات اور اعلان آنے لگے کہ انتخابات اور ان کے نتیجے میں بننے والی پارلیمنٹ بے وقعت لگنے لگی۔ ایک جرنل نے بیان دیا: ہوسکتا ہے کہ ۱۰۰ رکنی دستوری کمیٹی کے لیے پارلیمنٹ میں موجود پارٹیوں کے حجم کا لحاظ کیے بغیر ہر چھوٹی بڑی پارٹی سے پانچ پانچ ارکان لے لیے جائیں'' (ریفرنڈم کے ذریعے منظور ہونے والے عبوری دستور میں واضح طور پر لکھا ہے کہ یہ کمیٹی منتخب کمیٹی ہوگی)۔ پھر نائب وزیر اعظم ڈاکٹر علی السلمی نے کئی بنیادی دستوری شقوں کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ اسمبلی میں جو بھی آئے، دستور جو بھی بنائے یہ نکات بہرصورت جوں کے توں رہیں گے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ عسکری سپریم کونسل کی وضع کردہ یہ دستوری شقیں انتخابات، پارلیمنٹ یا دستور سازی کے ہر نظام سے بالاتر ہیں اور انھیں کوئی چیلنج نہیں کرسکتا۔

ایک درفنطنی یہ چھوڑی گئی کہ صدارتی انتخابات اس وقت تک نہیں کروائے جائیں گے جب تک ملکی دستور وضع کر کے اس پر عوامی ریفرنڈم نہیں کروالیا جاتا۔ گویا ایک تو سارا دستوری عمل موجودہ عبوری صدر فیلڈ مارشل حسین طنطاوی کی زیرسرپرستی مکمل کیا جائے، اور دوسرے یہ کہ حالیہ عبوری فوجی حکومت کم از کم ۲۰۱۳ء تک جوں کی توں رہے۔ اس طرح کے بیانات و اعلانات کے دوران میدان التحریر میں فوجی کونسل کے خلاف مظاہرے جاری رہے۔ اخوان باقاعدہ طور پر اس میں شریک نہ ہوئے، البتہ ۱۸ نومبر کو ہونے والے عوامی دھرنے میں اخوان نے ایک بار پھر پوری قوت سے میدان التحریر میں اُترنے کا اعلان کیا اور فوجی کونسل کو خبردار کیا کہ وہ حقیقی جمہوریت کی راہ میں روڑے نہ اٹکائے۔ ساتھ ہی اخوان نے اپنے کارکنان کو ہدایت دی کہ کسی طور بھی اس پروگرام کو مستقل دھرنے کی شکل نہ دی جائے، بلکہ شام پانچ بجے لوگ میدان التحریر کو خالی کردیں۔ لاکھوں

افراد شریک ہوئے اور شام کو مظاہرین کی اکثریت گھروں کو واپس چلی گئی لیکن ابھی چند سو نوجوان باقی تھے کہ ان پر پولیس نے دھاوا بول دیا، شدید تشدد کیا اور اس طرح انتخابات سے ۱۰ روز قبل بدترین ہنگامے اور خوں ریزی شروع ہوگئی۔ تین روز میں ۴۵ افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور سیکڑوں زخمی ہوگئے۔ اخوان نے واضح کیا کہ یہ بلاجواز تشدد قوم کو انتخابات سے محروم کرنے اور فسادات کی طرف دھکیلنے کی سازش ہے، ہم اس کا حصّہ نہیں بنیں گے۔ ہنگاموں کی تپش فوج تک بھی پہنچنے لگی اور اصل ہدف (یعنی اخوان) میدان جنگ سے دور انتخابی تیاریوں میں مصروف رہے، تو مظاہرین کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے عبوری وزیراعظم عصام شرف کو قربانی کا بکرا بنا کر برطرف کر دیا گیا، کمال جنزوری کو عبوری وزارت عظمیٰ اور نئی کابینہ دے دی گئی۔

● **جیتنے والی دینی جماعتیں اور مستقبل:** اسی دوران انتخابات کا آغاز ہوگیا۔ سازشیں اور مکارانہ چالیں ہنوز عروج پر ہیں۔ منتخب اسمبلی پر بالادستی حاصل کرنے کے لیے انتخابی عمل کے دوران ہی میں، فوجی کونسل نے ایک ۴۰ رکنی دستوری مشاورتی کمیٹی قائم کرنے کا اعلان کر دیا۔ اخوان کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی گئی لیکن انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ ہم منتخب ایوان کو بائی پاس کرنے والی کسی مجلس میں شریک نہیں ہوں گے۔ فوجی کونسل نے یہ اعلان کرتے ہوئے کہ اس کی حیثیت دستوری نہیں صرف مشاورتی ہوگی مجلس قائم کر دی ہے۔ اخوان اور دیگر کئی جماعتوں نے تصادم کے بجائے اس بارے میں اپنا اصولی موقف واضح کر دینے کے بعد اپنی ساری توجہ انتخاب کے باقی مراحل پر ہی مرکوز رکھی ہے۔

انتخابات کے پہلے ہی روز لوگوں کی بے مثال شرکت اور پہلے مرحلے کے نتائج سے ہی قوم کا اصل رجحان و اعتماد پوری دنیا کے سامنے آ گیا۔ مختلف اسلامی تنظیموں کو ۶۵ فی صد ووٹ حاصل ہوئے ہیں۔ باقاعدہ سرکاری نتائج کے مطابق اخوان کو ۴۱ فی صد ووٹ ملے (اب کہا جا رہا ہے کہ یہ ۳۷ فی صد ہیں)۔ دوسرے نمبر پر النور پارٹی کو ۲۴ فی صد (پہلے اعلان کے مطابق ۲۰ فی صد)، اور تیسرے نمبر پر حزب الوسط کو ۶ فی صد ووٹ ملے ہیں۔

'النور' بنیادی طور پر تین دینی جماعتوں کا اتحاد ہے جس نے النور پارٹی کے بینر تلے انتخاب لڑا ہے۔ ان میں دو سلفی، یعنی اہل حدیث جماعتیں ہیں 'النور' اور 'الاصالۃ' اور تیسری البناء والتنمیة

(تعمیر وترقی پارٹی) ہے جو کہ سابقہ الجماعة الاسلامیة المسلحة کی نوتشکیل شدہ سیاسی جماعت ہے۔ یہ جماعت پہلے مسلح جدوجہد کی طرف نکل گئی تھی لیکن اب ان کی اکثریت پُرامن دعوتی و سیاسی سرگرمیوں کی طرف واپس آگئی ہے۔ اس وقت سلفی جماعتوں میں ایسے دھڑے بھی ہیں جو پہلے حکمرانوں اور ان کے ساتھیوں کو واجب القتل قرار دیتے تھے، ایسے بھی ہیں کہ جو حاکم کے خلاف احتجاج اور مظاہرے کو بھی حرام قرار دیتے تھے، اور وہ بھی ہیں کہ جو پہلے جمہوریت اور انتخابات کو کفر قرار دیتے تھے۔ حسنی مبارک کے جانے اور آزادانہ سیاسی جدوجہد کی اجازت ملنے کے بعد اب یہ سب حضرات مجتمع ہیں اور خود کو وقت و حالات کے مطابق ڈھالنے کی سعی کر رہے ہیں۔ ملک کی دوسری بڑی سیاسی قوت کے طور پر سامنے آنے سے ان کی ذمہ داریوں میں بہت اضافہ ہوگیا ہے۔ عمومی طور پر ان کے ذمہ داران نے اپنے بیانات میں احتیاط برتی ہے، لیکن دوسرے اور تیسرے درجے کے رہنماؤں نے کئی ایسے بیانات بھی دیے ہیں، جنھیں ذرائع ابلاغ نے معاشرے کو اسلامی حکومت سے خوف زدہ کرنے کے لیے بہت اچھالا ہے۔

انتخاب جیتنے والی تیسری دینی جماعت 'الوسط پارٹی' ہے جسے ۶ فی صد ووٹ ملے، بنیادی طور پر اخوان ہی سے الگ ہونے والے بعض افراد پر مشتمل ہے۔ اخوان پر لگنے والی مسلسل پابندیوں کے تناظر میں بعض نوجوانوں نے، ابوالعلا ماضی کی سربراہی میں خود کو ایک سیاسی جماعت کے طور پر رجسٹرڈ کروانے کی کوشش کی۔ آغاز میں بعض لوگوں کا تاثر تھا کہ اخوان نے خود ہی اپنے لیے کوئی راستہ نکالنے کی کوشش کی ہے، لیکن اخوان نے نہ صرف اس کی تردید کی بلکہ ان حضرات کا اخراج کردیا۔ حکومت نے بھی پارٹی رجسٹرڈ نہ کی اور اس طرح یہ حضرات نہ اخوان میں رہے اور اور نہ اپنی جماعت بنا سکے۔ حسنی مبارک کے زوال کے بعد سیاسی پارٹیاں رجسٹرڈ ہونے لگیں، تو سب سے پہلے الوسط کی سابقہ درخواست منظور کی گئی۔

دینی جماعتوں کے لیے ایک بڑا خطرہ یہ ہے کہ ان کے مابین اختلافات نہ پیدا کر دیے جائیں۔ معروف سیکولر اور متعدد مغربی تجزیہ نگاروں کی تحریروں کا اصل مرکزی نکتہ ہی یہ ہے کہ اخوان اور النور کا مزاج، طریق کار اور ترجیحات مختلف ہیں، دونوں میں جھگڑا ہوگا۔ اس تجزیے کے پیچھے ان کی خواہش اور کوششیں بھی صاف دکھائی دے رہی ہیں۔ بعض عرب ممالک بھی اختلافات کی

آگ پر ڈالروں کا تیل ڈالنے کے لیے بے تاب ہیں، لیکن اخوان اور النور کی قیادت نے اسی اُمید کو توانا کیا ہے کہ ان شاء اللہ لڑانے والوں کے خواب پورے نہیں ہوں گے۔ دوسرے مرحلے کی پولنگ کے دوران دونوں جماعتوں کے کارکنان نعرہ لگا رہے تھے: السلفیة والاخوان، اید واحدة فی کل مکان، ''اخوان اور سلفی ہر جگہ یک مشت ہیں''۔ کئی اہم سلفی رسائل بھی لکھ رہے ہیں کہ اس وقت معاملہ سیٹوں یا وزارتوں کا نہیں، اسلام اور اس کی صحیح تصویر پیش کرنے کا ہے۔ حسنی مبارک سے نجات کے بعد اخوان نے ۱۸ دیگر جماعتوں کے ساتھ مل کر جو اتحاد قائم کیا تھا، 'النور' پارٹی بھی اس کا حصّہ تھی۔ ان دنوں محترم سید منور حسن، امیر جماعت اسلامی پاکستان کی قیادت میں مصر جانے والے وفد کو اخوانی قائدین نے بتایا تھا کہ: سلفی احباب سمیت اتحاد کی اکثر جماعتوں کو اس سے پہلے عملی سیاست میں حصّہ لینے کا کوئی قابل ذکر تجربہ نہیں ہے۔ ہم کوشش کررہے ہیں کہ ان کی ہر ممکن حوصلہ افزائی کریں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ملک میں سیاسی عمل پروان چڑھے اور اس میں مضبوط سیاسی جماعتیں بھرپور حصّہ لیں۔

تیونس میں حالیہ منتخب حکومت تشکیل پا جانے سے بھی اختلافات کی سازشیں کرنے والے عناصر کو مایوسی ہوئی ہے۔ وہاں بھی اسلامی تحریک النہضة سب سے بڑی پارٹی بن کر سامنے آئی ہے، اور دوسرے نمبر پر آنے والی پارٹی ان سے کہیں پیچھے ہے اور بائیں بازو کی قدیم قوم پرست شناخت رکھتی ہے۔ وہاں بھی طویل ڈکٹیٹر شپ کے بعد سیاسی جماعتوں کے مابین سر پھٹول کی پیش گوئیاں کی جارہی تھیں، لیکن جس سہولت، کامیابی اور حسن انتظام سے النہضة نے اکثر سیاسی قوتوں کو ساتھ ملایا ہے، اس پر اپنے حیران اور دشمن پریشان ہیں۔

اخوان کی یہ پالیسی طے شدہ ہے کہ وہ تمام جماعتوں کے ساتھ مل کر قومی حکومت بنانے کی سعی کریں گے۔ تیونس اور مراکش کی نومنتخب حکومت ہو یا مصر میں چند ماہ بعد تشکیل کی منتظر مخلوط حکومت، ان سب کے سامنے حقیقی چیلنج اپنی ترجیحات کا درست تعین اور ان پر عمل درآمد ہے۔ مصر کے ایک عالم دین عبدالسلام البسیونی سے ملاقات ہوئی تو کہہ رہے تھے ترجیحات کا تعین اہم ترین مرحلہ ہے۔ مصر حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ جیسے اُولوالعزم صحابہ کبار کی خلافت میں شامل رہا ہے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ جیسے صحابیِ رسولؐ نے نظامِ ریاست چلایا، لیکن ابوالہول اور دورِ فراعنہ کے

سیکڑوں بت صدیوں سے موجود تھے اور آج تک موجود ہیں۔ خود ریاست رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور پورے دور خلافت راشدہ میں رومانی دینار رائج رہا جس پر صلیب بھی کندہ تھی (پہلا اسلامی سکہ اُموی دور میں ڈھالا گیا)۔ بتوں اور صلیب کا انکار عقیدۂ توحید کی بنیادی اساس میں شامل تھا، اسلام کا تعارف ہی لا الٰہ الا اللہ سے ہوتا ہے، لیکن حکمت، تدریج اور ترجیحات کے لازوال اصولوں کے تحت ہر کام کا اپنا وقت تھا۔

اسلامی تحریکوں کے سامنے ایک بڑا چیلنج شخصی نظام حکومت کو ایسی باقاعدہ دستوری ریاستوں میں تبدیل کرنا ہے، جس میں ہر فرد کے حقوق محفوظ ہوں۔ لوٹ مار اور کرپشن کے دروازے بند ہوں، لوگوں کو باعزت روزگار فراہم ہو، اور ملک کو تعمیر و ترقی کی راہ پر ڈالتے ہوئے پوری دنیا کے سامنے ایک حقیقی اسلامی فلاحی ریاست کا ماڈل پیش کیا جائے۔ نئی بننے والی حکومتوں کو درپیش اقتصادی چیلنج کی ایک جھلک دیکھنا چاہیں تو صرف یہ جان لیجیے کہ مصری سٹیٹ بنک کے مطابق ملک میں دسمبر ۲۰۱۰ء میں زرِ مبادلہ کے ذخائر ۳۶ ارب ڈالر تھے جو نومبر ۲۰۱۱ء میں ۲۰ ارب ڈالر تک پہنچ گئے ہیں۔ عبوری عسکری کونسل میں مالی اُمور کے نگران بریگیڈیر محمود نصر کے مطابق جنوری ۲۰۱۲ء تک یہ ذخائر صرف ۱۰ ارب ڈالر رہ جائیں گے۔ گویا حالات اتنے بگڑ جائیں گے یا بگاڑ دیے جائیں گے کہ آنے والی حکومت اس پر قابو نہ پا سکے۔

اسلامی تحریکوں کی کامیابی کے فوراً بعد ذرائع ابلاغ نے عجیب و غریب سوالات کی دھول اڑانا شروع کر دی ہے۔ سوال اٹھائے جا رہے ہیں کہ کیا خواتین کو کسی مخصوص لباس کا پابند بنا دیا جائے گا؟ کیا سیاحت کہ جس پر دونوں ملکوں کی اقتصادیات کا بنیادی انحصار ہے، کی حوصلہ شکنی کی جائے گی؟ اسلامی تحریکوں کی قیادت ان مسائل سے بخوبی آگاہ ہے۔ ان شاء اللہ ہر اقدام اپنے اپنے وقت پر انجام پائے گا اور دنیا کو اسلام کا حقیقی اُجلا چہرہ دیکھنے کو ملے گا۔ اخوان کے ذمہ دار کہہ رہے تھے ہمارے بھائی ہمارے لیے سجدوں کے دوران دُعا کیا کریں کہ اللہ ہماری مدد فرمائے۔ ریاست چلانے کی آزمایش پھانسیوں پر جھول جانے کی آزمایش سے بھی کڑی ہے۔ اللہ کی خاطر جینا بعض اوقات اللہ کی راہ میں مرنے سے بھی زیادہ دشوار ہو جاتا ہے۔

بنگلہ دیش میں انتقامی کارروائیاں

حافظ محمد ادریس

بنگلہ دیش میں جماعت اسلامی کی مرکزی قیادت اور بنگلہ دیش نیشنلسٹ پارٹی (بی این پی) کے دو لیڈر صلاح الدین قادر چودھری اور عبد العلیم، عوامی لیگی حکومت کے قائم کردہ نام نہاد انٹرنیشنل کرائمز ٹریبونل میں مقدمات کا سامنا کر رہے ہیں۔ حسینہ واجد کی حکومت نے اپنی پچھلی مدتِ حکومت میں بھی جنگی جرائم کے الزامات لگا کر اپنے مخالفین کو نشانۂ انتقام بنانا چاہا تھا، مگر بوجوہ اپنے ان عزائم کو وہ عملی جامہ نہ پہنا سکی۔ اس مرتبہ بھاری اکثریت سے کامیابی کے بعد عوامی لیگ نے اپنے ایجنڈے میں یہی ایشو سرِفہرست رکھا۔ بنگلہ دیش تحریک میں مشرقی پاکستان کی بنگالی آبادی نے بھی بلاشبہ کلیدی کردار ادا کیا تھا، مگر اس میں شک نہیں کہ اگر بھارت کی سرپرستی اور مکمل حمایت حاصل نہ ہوتی تو محض مکتی باہنی یا چھے نکاتی پروگرام کے علَم بردار سیاسی کارکن یہ منزل سر نہ کر سکتے۔ خانہ جنگی کے اس عرصے میں جماعت اسلامی نے ایک محبّ وطن جماعت کی حیثیت سے مقدور بھر کوشش کی کہ بدامنی اور انتشار کے اس ماحول میں عوام کو تحفظ دیا جائے، تاہم ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو یہ سانحہ رونما ہوا کہ ملک دولخت ہو گیا۔

عوامی لیگ حکومت نے اپنی پے درپے ناکامیوں کے بعد، ۴۰ برس گزرنے پر سیاسی حربے کے طور پر اپنے مدِمقابل راست فکر قیادت کو نشانہ بنانے اور راستے سے ہٹانے کے لیے جنگی جرائم کے نام سے جو ٹریبونل قائم کیا ہے، اس پر عالمی اداروں اور حقوقِ انسانی کی تنظیموں نے مکمل عدم اعتماد کا اظہار کر دیا ہے۔ ۲۰ نومبر ۲۰۱۱ء کو نائب امیر جماعت اسلامی بنگلہ دیش مولانا دلاور حسین سعیدی پر باقاعدہ فردِ جرم عاید کی گئی۔ ان کے علاوہ جو لوگ سال سے زیادہ عرصہ ہوا، جیل کی

سلاخوں کے پیچھے بند کیے گئے ہیں، ان میں جناب مطیع الرحمان نظامی امیر جماعت اسلامی بنگلہ دیش اور علی احسن محمد مجاہد قیم جماعت اسلامی بنگلہ دیش کے علاوہ محمد قمر الزمان اور عبدالقادر ملا شامل ہیں۔ پروفیسر نذیر احمد، حمید الرحمان آزاد، مولانا رفیع الدین احمد، مولانا اے ٹی ایم معصوم، رفیق النبی، عبدالرحمان اور مولانا عبدالمنان کو بھی جماعت اور اسلامی چھاترو شبر کے دیگر ۱۲ راہ نماؤں کے ساتھ گرفتار کر کے مختلف دیگر مقدمات میں ملوث کر دیا گیا ہے۔ اب تک دلاور حسین سعیدی صاحب کے بعد نظامی صاحب، مجاہد صاحب اور قمر الزمان صاحب پر بھی فردِ جرم عاید کر دی گئی ہے۔ استغاثہ نے ٹریبونل کے سامنے اظہار کیا کہ ابھی تک پوری تفتیش مکمل نہیں ہوسکی۔

اس دوران مولانا دلاور حسین سعیدی کے خلاف گواہیاں شروع ہوگئی ہیں۔ ان پر لگائے گئے الزامات میں سے ایک یہ ہے کہ انھوں نے ۱۹۷۱ء میں پاکستان آرمی سے قریبی تعلّق رکھا اور انھیں عوام کے خلاف کارروائیاں کرنے کی ترغیب دیتے رہے۔ ان کے خلاف ۶۸ گواہ تیار کیے گئے ہیں۔ ان گواہوں پر مولانا سعیدی کے وکلا جرح کر رہے ہیں، جس کے دوران بہت دل چسپ تضادات سامنے آرہے ہیں۔ تاہم عمومی رائے یہ پائی جاتی ہے کہ اگر عرب ملکوں کی طرح کوئی عوامی ریلا سڑکوں پر نہ نکلا اور عرب عوامی لہر کی طرح بنگلہ دیش عوامی لہر کا سماں پیدا نہ ہوا تو ٹریبونل حکومتی اشارے پر فیصلے صادر کر دے گا۔ ۷۱ سالہ مولانا سعیدی شوگر اور بلڈ پریشر کے مریض ہیں، انھیں علاج معالجے کی سہولیات بھی حاصل نہیں۔ انھیں اپنے خرچ پر اپنے معالج سے ملاقات کا بھی کم ہی موقع دیا گیا ہے۔

روزنامہ بنگلہ دیش ٹوڈے میں ۱۲ دسمبر کو ایک رپورٹ چھپی ہے جس میں جماعت اسلامی کے وکیل بیرسٹر عبدالرزاق نے ٹریبونل کے سامنے یہ شکایت پیش کی کہ محض الزام لگنے سے کوئی شخص مجرم نہیں بن جاتا، جب کہ حکومتی ذرائع ابلاغ اور وزیر قانون بیرسٹر شفیق احمد ان لوگوں کو مجرم قرار دے رہے ہیں۔ چیئرمین ٹریبونل جسٹس نظام الحق نے ان کی شکایت کو مبنی برحق قرار دیا اور کہا کہ وہ خود بھی ذرائع ابلاغ کی اس روش کو دیکھ کر کڑھتے ہیں۔ پروفیسر غلام اعظم صاحب (عمر: ۸۹ سال) کو بھی گرفتار کرنے کے لیے حکومت مسلسل دھمکیاں دے رہی ہے۔

غیر جانب دار حلقے ان تمام الزامات کو مضحکہ خیز اور انصاف کا گلا گھونٹنے کے مترادف قرار

دے رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ایک اہم پہلو جسے مکمل طور پر نظرانداز کر دیا گیا وہ بنگلہ دیش میں مقیم بہاری آبادی پر ہونے والے طویل مظالم کی داستان ہے۔ بنگلہ دیش کی تخلیق کے وقت اس آبادی کو علیحدگی پسندوں نے جس بُری طرح سے قتل و غارت گری، لوٹ مار اور عصمت دری کا نشانہ بنایا، اس کی داستانیں تو باقاعدہ ثبوتوں کے ساتھ موجود ہیں مگر ان کی کہیں کوئی شنوائی نہیں ہو رہی۔ بھارت کے تجزیہ نگار کلدیپ نائر نے بنگلہ دیش میں گذشتہ مہینے پانچ دن گزارے اور اس نے ان خیالات کا اظہار کیا کہ ٹربیونل قانون و انصاف کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ کلدیپ نائر کے بقول حسینہ واجد بھارت کو خوش کرنے کے لیے اپنے ہی ملک کو نقصان پہنچا رہی ہے۔ ایک انٹرویو میں اس نے یہ بھی کہا کہ حسینہ واجد حکومت نے یک طرفہ طور پر بھارت کو ٹرانزٹ کے حقوق دیے ہیں، جن کے تحت بھارت آسام میں علیحدگی پسندوں کو کچلنے کے لیے بنگلہ دیشی راہ داری استعمال کر رہا ہے۔ حسینہ واجد لوگوں کی نظروں میں عزت و احترام کھو بیٹھی ہے۔ اس نے جنگی جرائم کا ٹربیونل قائم کر کے خوف و ہراس پیدا کرنے اور اگلے انتخابات سے قبل اپنے مخالفین کو ٹھکانے لگانے کا جو فیصلہ کیا ہے، وہ خاصا خطرناک قدم ہے۔ (ہفت روزہ Blitz، ۴ دسمبر ۲۰۱۱ء)

بنگلہ دیش کے معروف صحافی انوار حسین مانجو (جو مجلس قانون ساز کے ممبر اور وزیر بھی رہے ہیں اور بنگلہ دیش کے لیجنڈ صحافی تفضّل حسین عرف مانک میاں کے فرزند ہیں) نے کہا ہے کہ ملک کے اندر حسینہ واجد حکومت کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے ایک بغاوت کی کیفیت عوام میں پیدا ہو گئی ہے۔ عوام الناس آج ہر مجلس میں یہ کہہ رہے ہیں کہ ملک میں سیاست نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی، محض لوٹ مار کا بازار گرم ہے۔ بنگلہ دیش کی عدالتوں کے بارے میں آج وکلا اور ماہرینِ قانون یہ کہہ رہے ہیں یہ عدالتیں انصاف کرنے کے بجائے حکومتی تیور دیکھ کر فیصلے صادر کر رہی ہیں۔ (ایضاً)

عالمی ذرائع ابلاغ بھی کہہ رہے ہیں کہ یہ ٹربیونل انصاف کے لیے قائم نہیں کیا گیا بلکہ حکمران اپنے راستے سے مخالفین کو ہٹانا چاہتے ہیں۔ بنگلہ دیش سے تعلّق رکھنے والے اشرف الزمان خان، جو ان دنوں امریکا میں مقیم اور گرین کارڈ ہولڈر ہیں، ان پر بھی فردِ جرم عاید کرنے کے لیے استغاثہ نے کیس ٹربیونل میں پیش کر دیا ہے۔ ایک دوسری معروف شخصیت معین الدین چودھری جو برطانوی شہری ہیں، انھیں بھی البدر کا کمانڈر ہونے کے الزام کے تحت اسی فردِ جرم کا مرتکب قرار دیا گیا ہے۔

نیویارک ٹائمز (۳۰ نومبر ۲۰۱۱ء) میں ٹام فیلکس جے نے یہ خدشہ ظاہر کیا ہے کہ ان لوگوں کو ان کی غیر حاضری میں سزا سنادی جائے گی۔ مضمون نگار نے تفصیلاً لکھا ہے کہ بہاری آبادی پر ڈھائے جانے والے مظالم کا تو کوئی تذکرہ نہیں، البتہ بنگالی آبادی کے قتل عام کا بہت غلغلہ ہے۔ مضمون نگار کے بقول: انصاف کے تقاضوں کوملحوظ رکھا جائے تو ان پر یہ الزام ثابت کرنا خاصا مشکل ہے۔ مضمون نگار نے لکھا ہے کہ ۱۷۷۵ ایسے افراد کی فہرست غیر جانب دار لوگوں نے تیار کی ہے جن میں عوامی لیگ سے تعلّق رکھنے والے افراد بھی مجرم قرار دیے گئے ہیں۔ مضمون نگار نے ایم اے حسن نامی ایک سماجی کارکن کا حوالہ دیا ہے جس نے جنگی جرائم کے حقائق جمع کیے ہیں، اس کے مطابق اگر جرم کا ارتکاب ہوا ہے تو مجرم دونوں جانب ہیں مگر طرفہ تماشا یہ ہے کہ قانونی کارروائی (انتقامی) یک طرفہ ہورہی ہے۔

ڈیلی سٹار ڈھاکہ (۱۲ دسمبر ۲۰۱۱ء) کے مطابق مولانا دلاور حسین سعیدی کے خلاف حوالدار محبُوب العالم کی گواہی پر مولانا کے وکیلِ دفاع بیرسٹر میزان الاسلام نے ایک دستاویز عدالت میں پیش کی، جس کے مطابق حوالدار نے وزیراعظم کی خدمت میں پیروج پور کے ڈپٹی کمشنر کی وساطت سے ایک درخواست پیش کی کہ اسے مکان تعمیر کرنے کے لیے سرکاری خزانے سے امداد دی جائے۔ جب حوالدار پر جرح کی گئی تو استغاثہ کے وکلا نے شور مچایا کہ یہ دستاویز جعلی ہے اور ٹریبونل کے چیئرمین جسٹس نظام الحق نے سماعت اگلے دن تک ملتوی کردی۔ یہ ٹریبونل کا جو ڈھونگ رچایا گیا ہے، کچھ معلوم نہیں کہ اس سے کیا برآمد ہوگا؟ نیوز ویک نے ۲۳ دسمبر کے شمارے میں بنگلہ دیش پر خصوصی نمبر شائع کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی تمام مضامین بنگلہ دیش کی تخلیق ہی کے حوالے سے لکھے گئے ہیں، مگر بین السطور جگہ جگہ ٹریبونل اور اس کی انتقامی کارروائیوں کا حوالہ بھی ملتا ہے۔

بنگلہ دیش کے حالات سے باخبر اہلِ دانش کی راے ہے کہ عالمِ عرب میں طویل خاموشی اور مردنی کے بعد جو بیداری کی لہر اُٹھی ہے، اس نے ساری مسلم دنیا پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ بنگلہ دیش کے عوام سیاسی لحاظ سے بہت پختہ اور کئی تجربات کے حامل ہیں۔ موجودہ گھٹن کے نتیجے میں یہاں بھی بنگالی بہار کا سماں پیدا ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''بعض اوقات تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو مگر اس میں تمھارے لیے بھلائی (پنہاں) ہوتی ہے''۔


SINCE 1979
SUNDiP®
Naturally Better®
Hot Chilli Sauce
Soy Sauce
Vinegar
Free
Available at all leading stores
#1 PREMIUM QUALITY
SUNDiP
醬油
Soy Sauce
800ml
辣椒醬
Hot Chilli Sauce
合成醋
Synthetic Vinegar

رسائل و مسائل

والدین کے حقوق: چند مسائل

سوال: ہمارے حلقۂ احباب میں چند مسائل کے متعلّق بحث و اختلاف کی صورت پیدا ہوگئی ہے۔ براہِ کرم ان کی صحیح حقیقت سے آگاہ کریں۔ مسائل درجِ ذیل ہیں:

۱- کیا حدیث میں یہ مذکور ہے کہ قیامت کے دن انسان اپنی ماں کی جانب منسوب کیے جائیں گے؟ بعض اصحاب والدہ کی فضیلت اور اُس کے حقوق کے سلسلے میں یہ حدیث بیان کرتے ہیں۔

۲- کوئی باپ اپنے بیٹے یا بیٹی کو قتل کردے تو کیا اُس سے قصاص نہیں لیا جائے گا؟ اور کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ قاتل مقتول کا وارث ہے اور وہ اپنے آپ کو معاف کرسکتا ہے؟ جن جرائم کا حقوق العباد سے تعلّق ہے، کیا اُن کے بارے میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ جس فرد کی جان یا مال پر دست درازی ہوئی ہے، اگر وہ معاف کردے تو حق مارنے والے سے بازپُرس نہ ہوگی؟

۳- ماں باپ کی اطاعت کن اُمور میں اولاد پر جائز اور فرض ہے؟ کیا والدین کے حکم سے کوئی بیٹا شرعاً مجبُور ہے کہ اپنی بیوی کو طلاق دے؟

جواب: ۱- اس امر میں تو کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے والدین کے حقوق و واجبات پر بہت زور دیا ہے، اُن سے حسنِ سلوک کی بہت تاکید فرمائی ہے اور اپنے حقوق کے ساتھ والدین کے حقوق بیان کیے ہیں۔ بعض صحیح احادیث میں جہاں والدین سے صلۂ رحمی کا حکم دیا گیا ہے، وہاں ایک یا دو مرتبہ پہلے والدہ کا ذکر ہے اور اس کے بعد

والد کا ذکر ہے، لیکن جس مضمون کا حوالہ سوال میں دیا گیا ہے، یہ کسی صحیح اور مستند حدیث میں وارد نہیں ہے۔ اگرچہ بعض حدیث کے مجموعوں میں ایک روایت اس طرح کی مذکور ہے، لیکن محدثین اور فنِ رجال کے ماہرین کے نزدیک یہ غیر صحیح ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

یُدْعَی النَّاسُ بِاُمَّھَاتِھِمْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ سِتْراً مِنَ اللّٰہِ عَلَیْھِمْ، قیامت کے روز لوگوں کواُن کی ماؤں کے نسب سے پکارا جائے تاکہ اللہ کی جانب سے ان کی پردہ داری ہو۔

امام ابن جوزیؒ نے اسے موضوعات میں شمار کیا ہے۔ امام سیوطیؒ نے اپنی کتاب التعقبات علی الموضوعات میں اگرچہ بہت سی ان احادیث کو موضوعات سے خارج قرار دیا ہے جن پر ابن جوزیؒ نے وضع کا حکم لگایا ہے، لیکن اس روایت کو تعقبات، باب البعث میں ابن عدیؒ کے حوالے سے منکر ہی لکھا ہے۔ منکر اُس ضعیف روایت کو کہا جاتا ہے جس کا راوی فحش غلطی، شدید غفلت یا فسق و فجور کا مرتکب ہو۔

والدین اور بالخصوص والدہ کے اکرام و احترام پر دلالت کرنے والی واضح نصوص جب کتاب و سنت میں موجود ہیں، تو اس کے بعد ایسی منکر یا موضوع روایت کا سہارا لینے کی کیا حاجت ہے، جس میں ماں کی افضلیت کا کوئی خاص پہلو نہیں نکلتا اور جو قرآن مجید (سورۂ احزاب) کی اُس آیت سے بھی مطابقت نہیں رکھتی جس میں لوگوں کو ان کے باپوں کے نسب سے پکارنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔

۲- یہ صحیح ہے کہ فقہا کی اکثریت اس امر کی قائل ہے کہ باپ اولاد کو قتل کردے، تو اُس سے قصاص نہیں لیا جائے گا، لیکن یہ اس بنا پر نہیں کہ باپ بیٹے کا وارث یا ولیِ قصاص ہے اور وہ چاہے تو اپنے آپ کو معاف کردے۔ اپنے جرم پر اپنے آپ ہی کو قابلِ معافی قرار دینے کا تصور بالکل لغو ہے اور یہ بات بھی غلط ہے کہ ہر شخص جو مقتول کا وارث بن سکتا ہو، یا مطالبۂ قصاص کا قانونی حق رکھتا ہو، وہ اگر خود ہی قاتل ہو تو اُس سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔ باپ کو اولاد کے قتل کرنے پر قصاص سے صرف اس وجہ سے مستثنیٰ سمجھا گیا ہے کہ اُس کے حقوق اولاد پر بے حد و حساب ہیں۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک صحابی اور اُس کے بیٹے کی

ناچاقی کی خبر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو آپؐ نے بیٹے کو مخاطب کر کے فرمایا: اَنْتَ وَمَالُكَ لِاَبِيْكَ (البیھقی)، ''تو اور تیرا مال و متاع سب تیرے والد کا ہے''۔ ایک دوسری حدیث میں اولاد کو والدین کی کمائی میں شمار کیا گیا ہے۔ اولاد کے بالمقابل، والدین کی اس غیر معمولی مرتبت و منزلت کی بنا پر یہ استنباط کیا گیا ہے کہ والدین سے اولاد کا قصاص نہ لیا جائے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں ہے کہ اگر والد اولاد کو ناحق قتل کرے تو عنداللہ بھی اُس سے باز پُرس نہ ہوگی۔

والدین کے ماسوا دوسرے اعزہ جنھیں وراثت یا قصاص کی ولایت اور مطالبے کا حق پہنچتا ہے، وہ اگر خود اپنے مورث کے قاتل ہوں تو وارث ہونے کے باوجود اُن سے قصاص لیا جاسکتا ہے اور اگر محض ورثہ حاصل کرنے کے لیے اُنھوں نے قتل کا ارتکاب کیا ہو تو وہ ارشادِ نبویؐ کے مطابق محروم الارث بھی قرار پائیں گے۔

اسلامی شریعت کا یہ اصول بھی ہرگز نہیں ہے کہ جن جرائم کا تعلّق حقوق العباد سے ہے، اُن میں اگر مظلوم یا اس کا ولی معاف کر دے تو ریاست ظالم یا مجرم سے مواخذہ نہیں کرسکتی۔ بہت سے جرائم جن کا تعلّق انسان کی جان، مال یا آبرو سے ہے وہ حکومت کی دست اندازی کے قابل اور احتساب کے لائق ہیں اور وہ فریقین کے مابین قابل راضی نامہ بھی نہیں۔ مثال کے طور پر زنا، چوری یا ڈاکا، ایسے جرائم ہیں جن پر ریاست ہر حال میں گرفت کرے گی اور سزا دے گی، کیونکہ انفرادی قتل تو بسااوقات ذاتی پُرخاش یا وقتی محرکات پر مبنی ہوسکتا ہے جس میں مقتول کے ورثا اگر دیت یا عفو و درگزر پر راضی ہو جائیں تو مزید انتقامی کارروائی، خوں ریزی اور فساد کا سدّ باب ہوسکتا ہے، لیکن مذکورہ بالا اجتماعی جرائم کی نوعیت ایسی ہے جن میں نرمی یا چشم پوشی برتنے سے مزید شر اور فتنوں کے پھیلنے کا امکان قوی ہو جاتا ہے۔ قتل میں بھی اگرچہ مقتول کے اولیا، دیت لے لیں یا معاف کر دیں تو قصاص کی سزا تو نافذ نہ ہوگی، لیکن بعض فقہا کا قول یہ ہے کہ اولیا کے راضی ہو جانے کے باوجود اگر اسلامی حکومت یہ سمجھے کہ فتنہ و فساد کے اسباب کا پوری طرح قلع قمع کرنے کے لیے قاتل کو کچھ تادیب و تعزیر ضروری ہے، تو ایسا کیا جاسکتا ہے۔

۳- جو افعال خدا اور رسولؐ کے نزدیک ممنوع یا مذموم ہیں، اُن میں کسی کی اطاعت جائز نہیں، بقیہ اُمور میں والدین کی اطاعت جائز و مستحسن، بلکہ اکثر حالات میں لازم ہے۔ جہاں تک

باپ کے کہنے پر بیوی کو طلاق دینے کا سوال ہے، اس کا جواب بھی یہی ہے کہ بیٹا صرف اسی صورت میں طلاق دے، جب کہ والد کا حکم کسی مصلحت شرعی پر مبنی ہو، ورنہ ناحق طلاق خدا کی نگاہ میں بہرحال ناپسندیدہ اور مبغوض ہے۔

دراصل یہ مسئلہ آغاز میں اس طرح پیدا ہوا تھا کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے اپنے صاحبزادے سے کہا تھا کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو اور اُنھوں نے تعمیلِ ارشاد کرتے ہوئے طلاق دے دی تھی، مگر ظاہر ہے کہ ہر باپ حضرت عمرؓ کا قائم مقام نہیں ہوسکتا۔ حضرت عمرؓ ایک جلیل القدر صحابیِ رسولؐ اور صاحبِ اتقاء انسان تھے۔ اُن کی پاکیزہ زندگی اور بے مثال سیرت کو سامنے رکھتے ہوئے اُن سے بجا طور پر یہی توقع کی جاسکتی ہے کہ اُنھوں نے اس خواہش کا اظہار کسی معقول علّت اور دینی مصلحت ہی کے تحت کیا ہوگا جس کی وضاحت مناسب یا ضروری نہ ہوگی اور حضرت ابن عمرؓ نے اسی اعتماد کی بنا پر آپ کا کہا مان لیا ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت عمرؓ نے وجہ بیان کردی ہو مگر وہ آگے نقل ہونے سے رہ گئی ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک باپ جب چاہے، اپنے بیٹے سے بیوی کو طلاق دینے کا مطالبہ کرسکتا ہے اور بیٹے کے لیے اس کی تعمیل کیے بغیر چارہ ہی نہیں ہے۔(ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۶۶ء)۔(جسٹس ملک غلام علی، رسائل و مسائل، ششم، ص ۱۴۴-۱۴۸)

بیع سلم

س: آج کل کاروبار اور تجارت میں پیشگی سودوں کا رواج عام ہے، یعنی بعض اجناس وغیرہ کا نرخ پہلے طے کرلیا جائے اور لین دین بعد میں ہوتا رہے۔ بعض علما اسے بیع سلم قرار دے کر جائز ٹھیراتے ہیں، لیکن بیع سلم کی تعریف عام طور پر معلوم نہیں ہے۔ براہِ کرم اس کی تعریف اور شرائط وغیرہ واضح طور پر تحریر کریں تاکہ خرید و فروخت کے معاملات میں جواز و عدم جواز کا فیصلہ کرنے میں آسانی ہو اور لاعلمی کی بنا پر کوئی غلط یا ممنوع کارروائی صادر نہ ہونے پائے۔

ج: شریعت میں بیع سلم سے مراد ایسی خرید و فروخت ہے جس میں قیمت تو نقد ادا کردی

جائے گی، لیکن اُس کے عوض مال ایک متعین مدت کے بعد وصول کیا جائے۔ اس کے جائز اور صحیح ہونے کے لیے حدیث اور فقہ کی رُو سے جو شرائط لازم ہیں، اُن میں اہم ترین شرائط، جن پر قریب قریب اتفاق ہے، ذیل میں درج ہیں:

۱- مال اور اُس کی قیمت کا ٹھیک ٹھیک اور واضح تعیّن کیا جائے، اُس کا وزن، اُس کی نوعیت اور قسم وغیرہ کی ایسی تشریح کر دی جائے کہ بعد میں اشتباہ یا اختلاف یا نزاع کی گنجایش نہ رہے۔

۲- مال ایسا ہونا چاہیے کہ اس نمونے یا اس قسم کا مال سودا کرتے وقت بازار میں بہ سہولت دستیاب ہو، یا عن قریب دستیاب ہو جانے کی توقع ہو۔

۳- جتنی مدت کے بعد مال وصول ہوگا، اُس مدت کا بھی ٹھیک تعیّن ہو۔

۴- قیمت بھی بالکل متعین اور مقرر ہو اور سودا کرتے وقت پیشگی ادا کر دی جائے۔

۵- سودے میں مال کی واپسی اور بیع کی منسوخی کی شرط نہ ہو۔

۶- اگر مال کے نقل وحمل میں دقّت اور مصارف کا سامنا ہو، تو پھر اُس مقام کا بھی تعیّن ضروری ہے جہاں وہ مال مشتری کے سپرد کیا جائے گا۔ (ایضاً، ص ۳۵۶-۳۵۷)

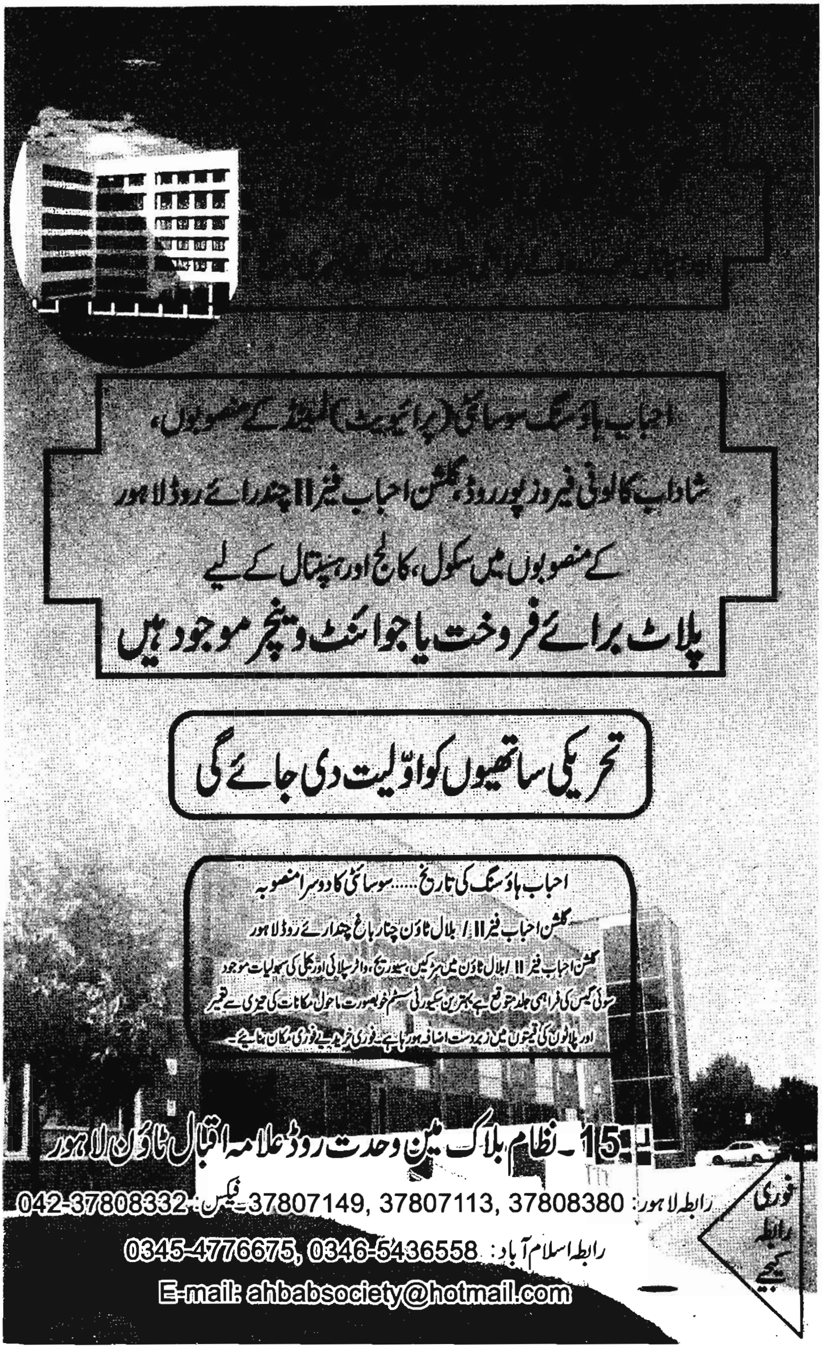
بلاسود بیمہ پالیسی

س: میرا بیٹا بیمہ پالیسی لینا چاہتا تھا۔ میں نے اسے منع کر دیا۔ الحمدللہ اس نے پالیسی نہیں لی۔ بعد میں اس نے بتایا کہ الفلاح بنک جو کہ مولانا تقی عثمانی نے بلاسود متعارف کرایا ہے، ان کی بیمہ پالیسی میں سود شامل نہیں ہے۔ کیا ان سے بیمہ پالیسی لی جاسکتی ہے؟

ج: آپ نے اپنے بیٹے کو بیمہ پالیسی لینے سے منع کیا اور بیٹے نے آپ کے حکم کی اطاعت کی۔ اس پر آپ دونوں مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اس دینی جذبے کو آپ کے لیے دنیا اور آخرت میں رحمتوں اور برکتوں کا ذریعہ بنادے، آمین! مولانا تقی عثمانی صاحب محقق، عالمِ دین اور اسلامی معیشت کے ماہر ہیں۔ انھوں نے اگر کسی بنک کی پالیسی کو غیرسودی قرار دیا ہے تو وہ درست ہے۔ اس بنک کی پالیسی لی جاسکتی ہے۔ (مولانا عبدالمالک)

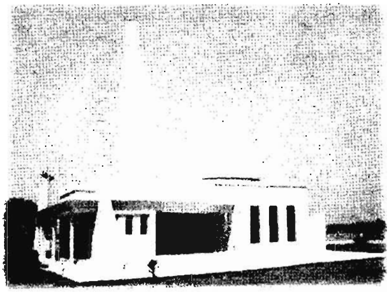
موٴمن نہ کسی کو دھوکہ دیتا ہے، نہ اُسے کوئی دھوکہ دے سکتا ہے۔ (حضرت عمر فاروقؓ)

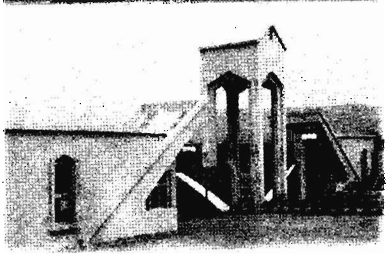



احباب ہاؤسنگ سوسائٹی (پرائیویٹ) لمیٹڈ کے منصوبوں،
شاداب کالونی فیروزپور روڈ، گلشن احباب فیز II چندرائے روڈ لاہور
کے منصوبوں میں سکول، کالج اور ہسپتال کے لیے
پلاٹ برائے فروخت یا جوائنٹ وینچر موجود ہیں
تحریکی ساتھیوں کو اوّلیت دی جائے گی
احباب ہاؤسنگ کی تاریخ......سوسائٹی کا دوسرا منصوبہ
گلشن احباب فیز II / بلال ٹاؤن چنار باغ چندرائے روڈ لاہور
گلشن احباب فیز II / بلال ٹاؤن میں سڑکیں، سیوریج، واٹر سپلائی اور بجلی کی سہولیات موجود
سوئی گیس کی فراہمی جلد متوقع ہے بہترین سکیورٹی سسٹم خوبصورت ماحول مکانات کی تیزی سے تعمیر
اور پلاٹوں کی قیمتوں میں زبردست اضافہ ہو رہا ہے۔ فوری خریدیے فوری مکان بنائیے۔
15۔ نظام بلاک مین وحدت روڈ علامہ اقبال ٹاؤن لاہور
رابطہ لاہور: 37807149, 37807113, 37808380 فیکس: 042-37808332
رابطہ اسلام آباد: 0345-4776675, 0346-5436558
E-mail: ahbabsociety@hotmail.com
فوری رابطہ کیجیے

NOC-91/N-1/TP/TMA/FJ

موٹروے سٹی





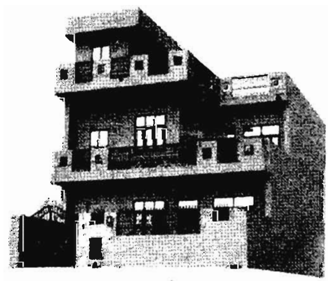
ایگزیکٹو بلاک (بکنگ جاری)

محل وقوع:

نیو اسلام آباد انٹرنیشنل ایئرپورٹ، جماعت اسلامی کے قرطبہ سٹی، تنازہ ڈیم جیسی خوبصورت تفریح گاہ اور مارگلہ وکھیری مورت کی سرسبز و شاداب پہاڑیوں کے وسط میں تعمیر ملت ایجوکیشن کے ساتھ واقع ہے۔

ترقیاتی کام:

سوسائٹی میں مین گیٹ، مسجد اور تین خوبصورت جھیلیں مکمل ہو چکی ہیں۔ 200 کنال پر محیط خوبصورت پارک کی تعمیر جاری ہے اور ماڈل گھروں کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے۔ ایک فیز کی پلاننگ مکمل کر کے ممبران کو قبضہ دیے جا رہے ہیں۔



قطبال ٹاؤن

اسلام آباد

(بکنگ جاری)

محل وقوع: یہ اسلام آباد ہائی وے سے 800 گز کے فاصلے پر کہنہ ایسٹ میں پہلے سے موجود آباد رہائشی سکیموں کے جھرمٹ میں واقع ہے۔ اسلام آباد ہائی وے، ایکسپریس روڈ اور کہنہ پل سے قریب ہونے کی وجہ سے 24 گھنٹے ٹرانسپورٹ کی سہولت۔

ترقیاتی کام: یہاں تمام بنیادی سہولیات بجلی، پانی اور گیس وغیرہ پہلے سے موجود ہیں اس کے علاوہ یہ سکیم انڈر گراؤنڈ سیوریج اور باؤنڈری وال سے آراستہ ہے۔ یہاں بنیادی سہولیات کی دستیابی و ترقیاتی کام مکمل ہونے کی وجہ سے آپ فوری رہائش رکھ سکتے ہیں، گھروں کی تعمیر کا کام تیزی سے جاری ہے۔

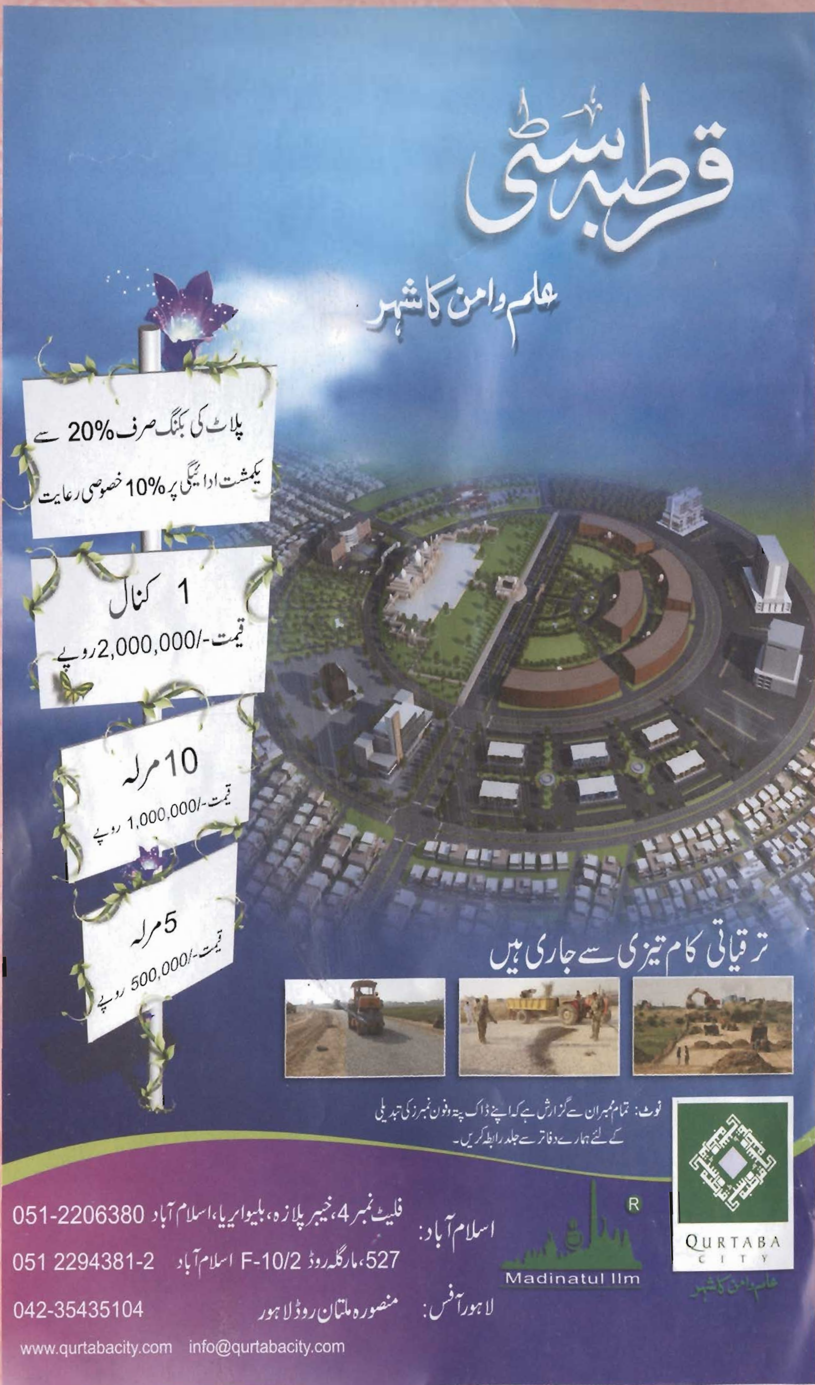
ضرورت نمائندگان

ملک بھر سے پلاٹوں کی بکنگ کے لیے نمائندوں / کمیشن ایجنٹس کی ضرورت ہے۔ پرکشش کمیشن پیکج دیا جائے گا۔

رابطہ: قاضی انٹرپرائزز 8 جنگ بلڈنگ مری روڈ، راولپنڈی U.A.N: 051-111-700-400, 051-5961923,5961682

Fax:051-5962230. Email: shaukat@isb comsats.net.pk. Web: www.qazigroup.com

مرزا محمد الیاس نے ارقم آفاق پرنٹر، بلال گنج سے چھپوا کر اچھرہ، لاہور سے شائع کیا۔



قرطبہ سٹی
علم و امن کا شہر
پلاٹ کی بکنگ صرف 20% سے
یکمشت ادائیگی پر 10% خصوصی رعایت
1 کنال
قیمت -/2,000,000 روپے
10 مرلہ
قیمت -/1,000,000 روپے
5 مرلہ
قیمت -/500,000 روپے
ترقیاتی کام تیزی سے جاری ہیں
نوٹ: تمام ممبران سے گزارش ہے کہ اپنے ڈاک پتہ و فون نمبرز کی تبدیلی
کے لئے ہمارے دفاتر سے جلد رابطہ کریں۔
اسلام آباد: فلیٹ نمبر 4، خیبر پلازہ، بلیوایریا، اسلام آباد 051-2206380
527، مارگلہ روڈ F-10/2 اسلام آباد 051 2294381-2
لاہور آفس: منصورہ ملتان روڈ لاہور 042-35435104
www.qurtabacity.com info@qurtabacity.com
Madinatul Ilm
QURTABA CITY
علم و امن کا شہر

C.P.L. 322 *Monthly* AALMI TARJUMAN - UL - QURAN LAHORE.
Ph: 3758 7916
Fax: 3753 5660

